جلد 8، شمارہ 3
ستمبر تا دسمبر، 2015

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا...

سال 2015 کے آخر میں سرمایہ دارانہ نظام اپنے دائرے کار کو مضبوط کرنے میں نہایت سرگرم نظر آیا۔ ستمبر میں اقوام متحدہ نے اگلے پندرہ سال کے لیے عالمی سطح پر پائیدار ترقیاتی اہداف پایہ تکمیل تک پہنچا دیے جس کے تحت 17 ترقیاتی اہداف اور 169 ذیلی اہداف پر مبنی ایجنڈا 2030 منظور کرلیا گیا ہے۔ دسمبر میں اقوام متحدہ فریم ورک برائے کلائمٹ چینج کنونشن کے ممبر ممالک کے اکیسویں اجلاس COP21 کے زیر نگرانی پیرس معاہدہ بھی طے پا گیا جبکہ عالمی تجارتی ادارے (ڈبلیو ٹی او) کا دسواں اجلاس دسمبر میں نیروبی، کینیا میں منعقد ہوا۔

ان سب اجلاسوں کی کارکردگی کا تجزیہ واضح کرتا ہے کہ سرمایہ داری نظام منافع کے حصول کو تیز کرنے کے لیے پچھلے 20 سال سے وضع کیے ہتھکنڈوں کو مزید پھیلانے میں کامیابی حاصل کرتا جارہا ہے جس کی بڑی مثال ایجنڈہ 2030 اور پیرس معاہدے ہیں۔ یہ دونوں معاہدے عوام کو غربت سے نکالنے اور دنیا کے تمام نمایاں گروہوں کی فیصلہ سازی میں شراکت پر بہت زور دیتے نظر آئیں گے لیکن ان معاہدوں کے تحت کیے گئے فیصلوں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ دراصل یہ بین الاقوامی کمپنیوں کو مقامی منڈیوں پر قبضہ مضبوط کرنے کے لیے کئی نئے راستے کھول کر دے رہے ہیں اور عوام کے لیے صرف بھوک و افلاس اور بیروزگاری کی تدبیریں ہیں۔ پیرس معاہدے کے تحت ایک طرف امیر ترین ممالک نے اپنے کاربن اخراج میں کمی کرنے کے لیے نہایت کمزور طریقے کار پیش کیے ہیں اور دوسری طرف موسمی تبدیلی سے معاشی، معاشرتی تباہیوں کی ذمہ داری سے مکمل طور پر ہاتھ اٹھالیا ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ وہ شعبے جو بے تحاشہ کاربن اخراج کے ذمہ دار ہیں مثلاً سمندری اور ہوائی جہاز رانی کا ذکر تک پیرس معاہدے سے نکال دیا گیا ہے۔

ایجنڈہ 2030 کے تحت امیر صنعتی ممالک نے منوا لیا کہ ''پائیدار ترقی'' کا سب سے بڑا پاسبان بین الاقوامی نجی شعبہ ہے۔ ترقی کے لیے درکار مالی وسائل نجی شعبے کی سرمایہ کاری سے حاصل کیے جائیں گے۔ یعنی پہلی دنیا کے امیر صنعتی ممالک اپنی حکومتی تجوریوں سے تیسری دنیا کے لیے امداد مشکل سے ہی مہیا کریں گے۔ ترقی کی آڑ میں نجی کمپنیوں کی تیار کردہ اشیاء و خدمات محنت کش عوام پر زبردستی لادی جائیں گی۔ پاکستانی عوام کے لیے یہ سب کچھ نیا نہیں، نیسلے پاکستان کی منافع کی شرح اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ عوام کیسے اپنے وسائل سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ ڈبلیو ٹی او میں نا دوحہ ترقیاتی راؤنڈ پر کوئی حتمی فیصلہ کیا گیا اور نا ہی امریکہ اور یورپی ممالک کی جانب سے اپنے کسانوں کو دی جانے والی کروڑوں ڈالرز کی امدادی رقوم پر کوئی بات چیت کی گئی۔ ''احسان'' یہ کیا گیا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو صرف دو سال کے لیے خوراک کے سرکاری زخیرے رکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔

ان حالات میں جب دنیا میں تقریباً ایک بلین افراد بھوک کا شکار ہیں، یقیناً موسمی تبدیلی کی وجہ سے رونما ہونے والے حادثات اس مسئلے کو مزید سنگین بنا رہے ہیں جس سے آنے والے سالوں میں حالات مزید بگڑ تو سکتے ہیں سدھر نہیں سکتے۔ آخر ہماری حکومتیں اس قدر کمزور کیوں ہیں؟ اس کا جواب ہماری تاریخ میں چھپا ہے۔ برطانوی راج کو قبضہ قائم کرنے کے لیے ہمارے درمیان سے ہی ان عوام دشمن عناصر کو پیدا کرنا تھا جو سامراج کو ہماری دھرتی پر لوٹ مار کی کھلی اجازت دیں۔ یہ سلسلہ ہمارے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور حکمرانوں کی صورت آج تک جاری ہے۔

یقیناً عوام کے لیے آسودگی اور وقار ان حکمرانوں کے بنائے ہوئے راستوں پر ناپید ہے۔ یہ راستے ہمیں خود اپنے خون پسینے سے بنانے پڑیں گے۔ جدوجہد کی منزلیں ہمارے خون کی گرمائش، ہمارے پسینے کی مہک، ہمارے زور بازو کی طاقت، ذہن کی چمک اور ہمارے جذبوں کی سچائی مانگتی ہیں!

فہرست مضامین

ایجنڈہ 2030: فریب کے ''نئے'' راستے 2
ڈبلیو ٹی او کا دسواں وزراتی اجلاس 7
پیرس کلائمٹ معاہدہ: ایک تنقیدی جائزہ 9
نیسلے پاکستان کا جائزہ 14
ہمارے حکمران- جاگیردار یا سرمایہ دار.... 26
پاکستان کا آبپاشی نظام: اصلاحات یا بگاڑ.. 33
بات تو سچ ہے مگر 40

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے میزریور کے تعاون سے شائع کیا ہے۔
سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی
فون، فیکس: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321
بلاگ: rootsforequity.noblogs.org

ایجنڈہ 2030: فریب کے ''نئے'' راستے

تحریر: ولی حیدر

پچھلے چند سالوں سے اقوام متحدہ ملینیم ترقیاتی اہداف (MDGs) پر عمل درآمد کے حوالے سے پیش رفت کا جائزہ لے رہی تھی جس سے معلوم ہوا کہ بہت سے ممالک میں طے شدہ اہداف حاصل نہ ہوسکے۔ ممالک نے ان اہداف کی ناکامی کی مختلف وجوہات بیان کیں جس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ پائیدار ترقی کے حصول کے لیے نئی ترجیحات طے کرنے کی ضرورت ہے جو نہ صرف غربت، بھوک اور تعلیم جیسے سماجی مسائل کا احاطہ کرتے ہوں بلکہ ممالک کے اندر اور ممالک کے درمیان موجود عدم مساوات اور اقتصادی ناہمواری کے خاتمے کے لیے معاون ہو۔ اس حوالے سے 2012 میں برازیل کے شہر ریو میں پائیدار ترقی کے حوالے سے کانفرنس کا اہتمام ہوا جس میں ان نکات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی اور ایک مسودہ "The Future We Want" ''مستقبل جو ہم چاہتے ہیں'' تیار کیا گیا۔ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے رواں سال ستمبر 2015 میں دنیا بھر کے رہنماؤں نے پائیدار ترقی کے لیے آئندہ آنے والے 15 سالوں کے لیے ایک نئے منصوبے کو منظور کیا جسے ایجنڈہ 2030 کا نام دیا گیا ہے اور اہداف کا نام بدل کر پائیدار ترقیاتی اہداف (Sustainable Development Goals/SDGs) رکھا گیا۔

ایجنڈہ 2030 میں 17 اہداف (Goals) اور 169 ذیلی اہداف (Targets) مقرر کیے گئے ہیں۔ 17 اہداف درج ذیل ہیں۔[1]

پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) کو تین شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔ سماجی اہداف۔

2۔ اقتصادی اہداف۔

3۔ ماحولیاتی اہداف۔

1۔ سماجی اہداف

ہدف 1: تمام مقامات سے ہر قسم کی غربت کا خاتمہ؛

ہدف 2: بھوک کا خاتمہ؛ تحفظ خوراک اور غذائیت کا حصول اور پائیدار زراعت کا فروغ؛

ہدف 3: صحت مند زندگی کو یقینی بنانا؛ اور تمام عمر کے تمام افراد کے لیے بہتر صحت کا فروغ؛

ہدف 4: مساویانہ بنیادوں پر یقینی معیاری تعلیم؛ اور سب کے لیے زندگی بھر سیکھنے کے مواقع؛

ہدف 5: بااختیار عورتیں اور لڑکیاں: صنفی مساوات کا حصول؛

ہدف 6: تمام افراد کے لیے پانی کی دستیابی، پائیدار انتظام اور حفظان صحت کا یقینی حصول؛

ہدف 11: محفوظ، مضبوط اور پائیدار شہروں اور انسانی بستیوں کا قیام؛

2۔ اقتصادی اہداف

ہدف 8: ہر طرح کی تفریق اور امتیاز کے بغیر پائیدار معاشی بڑھوتری اور تمام لوگوں کے لیے یقینی اور مہذب روزگار کا فروغ؛

ہدف 9: مضبوط ڈھانچہ کی تعمیر، ہر طرح کی تفریق اور امتیاز کے بغیر پائیدار صنعتوں کا فروغ اور جدت میں اضافہ؛

ہدف 10: ممالک کے اندر اور ممالک کے درمیان عدم مساوات میں کمی؛

ہدف 12: پائیدار بنیادوں پر پیداوار اور استعمال کو یقینی بنانا؛

3۔ ماحولیاتی اہداف

ہدف 7: سستی، قابل اعتماد، پائیدار اور جدید توانائی تک تمام افراد کی یقینی رسائی؛

ہدف 13: موسمی تبدیلی اور اس کے اثرات سے نمٹنے کے لیے فوری کارروائی؛

ہدف 14: سمندر، دریا اور سمندری وسائل کا پائیدار استعمال اور تحفظ؛

ہدف 15: زندہ اجسام اور دیگر غیر جاندار قدرتی وسائل (Terrestrial Ecosystem) کا بچاؤ، بحالی اور فروغ، پائیدار بنیادوں پر جنگلات کا انتظام، جنگلات کی کٹائی، زمین کے کٹاؤ اور حیاتیاتی تنوع کے نقصان کی روک تھام؛

جبکہ دو اہداف ایسے ہیں جو کہ دیگر تمام اہداف پر یکساں طور پر لاگو ہوتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

ہدف 16: پائیدار ترقی کے لیے پر امن اور ہر قسم کی تفریق اور امتیاز سے پاک معاشرے کا فروغ۔ تمام افراد کے لیے انصاف تک رسائی اور تمام سطحوں پر موثر جوابدہ اداروں کا قیام؛

ہدف 17: پائیدار ترقی کے لیے عالمی شراکت داری کے ذریعہ عمل درآمد کے ذرائع کو مضبوط بنانا؛

آیئے اب چند سماجی اہداف کے چند پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہیں۔

ہدف1 جو غربت کے خاتمے سے متعلق ہے، کے مجموعی طور پر سات ذیلی اہداف درج کیے گئے ہیں۔ ان میں چند بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں مگر چند تو انتہائی سطحی طور پر لکھ دیے گئے ہیں۔ سطحی اس لیے کے ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے جس سیاسی اور معاشی حکمت عملی کی ضرورت ہے وہ دور دور تک کم از کم ایجنڈہ 2030 کے دستاویز میں نظر نہیں آتی۔

مثلاً ذیلی ہدف 1.4 کے تحت 2030 تک تمام مردوں اور عورتوں خصوصاً غریبوں اور کمزوروں کے لیے اقتصادی وسائل تک مساوی حق، بنیادی خدمات تک رسائی، زمین اور دیگر جائیداد کی ملکیت اور اختیار سمیت قدرتی وسائل، مناسب ٹیکنالوجی اور مالیاتی خدمات بشمول مائیکرو فائنانس تک رسائی کو یقینی بنانا ہے۔

اوپر بیان کیے گئے ہدف کا باریک بینی سے تجزیہ کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ یہ کھوکھلے نعرے کے سوا کچھ نہیں۔ مثال کے طور پر موجودہ نظام میں جہاں طاقت اور دولت صرف ایک طبقے کے قبضے میں ہے اور دوسری طرف دنیا کی بہت بڑی آبادی خوراک، روزگار اور پانی جیسی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہیں تو کیسے اقتصادی وسائل تک مساویانہ رسائی ممکن ہوسکے گی؟ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ موجودہ نظام میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے۔ یہاں تک کہ دنیا کی تقریباً ایک ارب آبادی شدید بھوک کا شکار ہے عالمی مالیاتی ادارے خصوصاً آئی ایم ایف کی سخت شرائط کے تحت بنیادی سہولیات کی نجکاری اور مہنگائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ہدف 2b دوہا ترقیاتی دور (Doha Development Round) کے زیرنگرانی عالمی زرعی منڈی میں رکاوٹوں اور بگاڑ کو ٹھیک کرتا ہے، جس کے تحت ہر طرح کی زرعی برآمدات پر زرتلافی کے خاتمہ پر زور دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں چھوٹے بے زمین کسانوں کے لیے منڈی کو مزید کھول کر ان کے روزگار پر کاری زرب لگایا گیا ہے۔ ایسی معاشی، اقتصادی پالیسی اور لائحہ عمل کی بنیاد پر اوپر دیے گئے ہدف کا حصول ناممکن ہے۔

اس ہدف کا سب سے افسوسناک پہلو زمین اور جائیداد کی ملکیت اور اختیار کے حوالے سے ہے۔ ایجنڈہ 2030 کے پورے مسودے میں پاکستان جیسے دیگر ممالک جہاں جاگیرداری آج بھی قائم ہے کے خاتمے کا ذکر نہیں اور نہ اسے عدم مساوات کی ایک بنیادی وجہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ جاگیرداری کے خاتمے کے بغیر تمام مرد و عورت خصوصاً پسے ہوئے طبقات کو کس طرح زمین کی ملکیت اور اختیار حاصل ہوسکے گا؟

ہدف 1.4 میں مناسب نئی ٹیکنالوجی کا بھی ذکر ہے جس کے لیے زمین پہلے ہی ہموار کرلی گئی ہے خاص کر قابل تجدید ٹیکنالوجی کے لیے اور اب ملٹی نیشنل کمپنیوں کی تیار کردہ نئی نئی مصنوعات منڈی میں نظر آنا شروع ہوگئی ہیں۔ مثال کے طور پر شمسی توانائی سے بجلی کے حصول کے لیے شمسی پینل کا فروغ، موسم سے ہم آہنگ بیج وغیرہ منڈی میں موجود ہیں جو صرف سرمایہ کاروں کے لیے منڈی کھولے گی نہ کے مقامی آبادیاں اس سے مستفید ہوں گی۔ یہ یاد رہے کہ ڈبلیو ٹی او کے ٹرپس معاہدے کے تحت نئی ایجادات کے حصول کے لیے ذہنی ملکیتی کے مد میں بھاری رقم خرچ کرنا لازم ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلی دنیا میں جو اقتصادی بحران ابل ابل کر سامنے آرہا ہے اس کے حل کے لیے اقوام متحدہ کے سائے تلے تیسری دنیا کی حکومتوں اور عوام سے مزید منافع کے حصول کے لیے لائحہ عمل تیار کرلیا ہے۔

ہدف 2 جو کہ بھوک کے خاتمے اور تحفظ خوراک کے حصول سے متعلق ہے کہ چند اہداف مثلاً ہدف 2.3، 2030 تک زرعی پیداوار کو دگنا کرے، عورتوں، قدیم آبادیوں، کسانوں، چرواہوں اور ماہی گیروں کے زمین اور دیگر پیداواری وسائل، علم، مالیاتی خدمات منڈی اور مواقعوں تک مساویانہ رسائی پر زور دیتا ہے۔ یہاں پیداوار دگنی کرنے کی بات تو ہورہی ہے مگر یہ نہیں بتایا جارہا کہ یہ ہدف کس طرح حاصل کیا جائے گا؟ غالب خیال ہے کہ پیداوار بڑھانے کے لیے ہائیبرڈ بیج، جینیاتی بیج، کیمیائی کھاد اور دیگر مشینی طریقہ زراعت کو مزید فروغ دیا جائے گا جو ماحولیاتی بگاڑ کی اہم ترین وجوہات میں سے ایک ہے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر مقامی علم، روایتی بیجوں کو محفوظ اور انہیں بڑھانے کا کوئی ذکر کیوں نہیں کیا گیا۔ ایک طرف ڈبلیو ٹی او کے ٹرپس معاہدے کے تحت قدرتی اور پیداواری وسائل پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کا قبضہ ہوتا جارہا ہے اور چھوٹے اور بے زمین کسان کمپنیوں کے تیار کردہ پیداواری ذرائع کے محتاج ہوکر رہ گئے ہیں اور یہاں دکھاوے کے طور پر قدیم آبادیوں، ماہی گیروں اور عورتوں کو خود مختار بنانے کا مصنوعی ہدف طے کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں چھوٹے بے زمین کسانوں کے لیے زرعی منڈی کو مزید کھول کر ان کے روزگار کو مزید ضرب لگایا گیا ہے۔

اگر ہم پائیدار اقتصادی ترقی اور روزگار کے حوالے سے ہدف 8 کا جائزہ لیں تو مجموعی طور پر 12 ذیلی ہدف طے کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چند اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔ ہدف 8.1 اور 8.2 مجموعی قومی پیداوار اور اقتصادی پیداوار میں اضافے کے حصول کے حوالے سے ہیں جس میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ بہتر ٹیکنالوجی اور جدت کے ذریعے ان اہداف کو حاصل کیا جائے گا۔ جبکہ ہدف 8.3 ایسی پالیسیوں کے متعلق ہے جو پیداواری عمل میں مددگار، مہذب روزگار اور اپنے طور پر روزگار حاصل کرنے والوں کے فروغ کے لیے ہیں۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ روزگار کے حصول کا سب سے اہم اور بڑا ذریعہ صنعتوں کا قیام اور فروغ ہے۔ صرف پیداواری صنعت ہی وہ جگہ ہے جہاں ہزاروں مزدوروں کو روزگار حاصل ہوسکتا ہے اور زمینی حقائق کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نیو لبرل ازم کو نجکاری پالیسی اور دیگر عالمی تجارتی پالیسیوں اور بین الاقوامی کمپنیوں کے غلبے کی وجہ سے مقامی صنعتوں میں بڑے پیمانے پر کمی واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں لوگوں کا معیار زندگی کم ہوا ہے۔ ایک طرف صنعت کم ہوئی اور دوسری طرف غیر رسمی شعبہ میں روزگار بڑھتا نظر آتا ہے جو کہ یقیناً مہذب روزگار

کا ضامن ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ ہدف 8.9 اور 8.10 سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خدمات کے شعبے کے فروغ پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ اہداف سیاحت، بینکنگ، انشورنس جیسی خدمات کے شعبوں کو فروغ دیتے ہیں۔ معمولی اقتصادی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد بھی جانتے ہیں کہ جب پیداواری صنعتوں میں اضافہ اور تیزی نہیں ہوگی، حقیقی اقتصادی ترقی اور مہذب روزگار کا حصول جس کا ہدف 8 میں ذکر کیا گیا ہے ناممکن ہے۔

ماحولیاتی اہداف 15-13 موسمی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے فوری حکمت عملی سے لے کر سمندری وسائل، زندہ اقسام اور حیاتیاتی تنوع کے تحفظ جیسے عناصر پر مشتمل ہیں۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ زندہ اجسام اور حیاتیاتی تنوع کا تحفظ کیونکر ممکن ہے جبکہ گھنے جنگل تیزی سے کاٹے جارہے ہیں؟ آبی وسائل صنعتی تجارت اور سمندری وسائل کے استحصال کی وجہ سے بڑھتی ہوئی آلودگی کے نظر ہورہے ہیں۔ اس کے علاوہ حیاتیاتی تنوع تو اب منڈی میں بکنے والی شئے بن گئی ہے۔ کیونکہ ڈبلیو ٹی او کا ٹرپس معاہدہ تو زندہ اجسام پر ملکیتی حقوق دے کر ان کو چرانے کی راہ ہموار کرتا ہے، جس کے تحت آج بڑی بڑی بین الاقوامی کمپنیاں قدرتی وسائل خصوصاً بیج پر اپنا حق منوا کر کسانوں کے روزگار سے کھیل رہی ہیں۔ اسی طرح کیا بڑے بڑے رقبوں پر یکساں فصلوں (مونوکلچر) اور جینیاتی بیجوں کے فروغ سے حیاتیاتی تنوع کا بچاؤ ممکن ہے؟ یا پھر انہی سرگرمیوں کی وجہ سے حیاتیاتی تنوع محدود سے محدود تر ہوتا جارہا ہے جو کہ کائنات کے توازن میں بگاڑ پیدا کررہا ہے اور نتیجے میں موسمی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔

ایجنڈا 2030 کے تحت اس کے 17 اہداف کے علاوہ اس دستاویز کے اعلامیہ کے مختلف پہلو انتہائی تشویش ناک ہیں اور انہیں سمجھنا انتہائی اہم ہے تاکہ اقوام متحدہ اور اس کے ہمنوا امیر سرمایہ دار ممالک کی چالوں کو سمجھا جاسکے اور اس کی روشنی میں عوامی گروہوں اور تنظیموں کو اپنے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کرنے میں مدد مل سکے۔

ایک طرف اعلامیے کا نکتہ نمبر 27 اقتصادی خوشحالی کے لیے عدم مساوات کے خاتمے کی بات کرتا ہے اور نکتہ نمبر 30 ملکوں کو سختی سے کہتا ہے کہ وہ اپنے طور پر یکطرفہ کوئی ایسا اقتصادی اور تجارتی اقدام نہ کریں جو عالمی قوانین اور اقوام متحدہ کے چارٹر سے مطابقت نہ رکھتے ہوں اور ترقی پزیر ممالک کی اقتصادی اور سماجی کامیابیوں میں رکاوٹ پیدا کرے۔

مگر دوسری طرف نکتہ 39 نجی سرمایہ کاروں کے کردار اور نکتہ 41 نجی شعبہ جس میں بین الاقوامی کمپنیاں شامل ہیں، کے کردار کو بھی تسلیم کرتا ہے اور نکتہ 44 میں عالمی مالیاتی اداروں کی مدد کو بھی تسلیم کیا گیا ہے۔

تضاد واضح ہے اگر ممالک اور آبادیوں کی حقیقی خودمختاری کی بات ہوگی تو وہاں ملٹی نیشنل کمپنیوں اور سرمایہ کاروں کا کردار قطعی طور پر سمجھ سے بالا تر ہے کیونکہ اعداد وشمار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جہاں جہاں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کردار کو جگہ دی گئی وہاں عوام کی فلاح اور ماحولیاتی کے تحفظ کے بجائے ان کمپنیوں کے منافع میں کئی گنا اضافہ دیکھنے میں آیا۔ اسی لیے بہت سے حلقوں کا کہنا ہے کہ اقوام متحدہ نے پائیدار ترقی کے اہداف کو نجی شعبہ کے حوالے کردیا ہے۔[2]

ایسا نہیں کہ عوامی گروہوں اور عوام دوست تحریکوں نے اقوام متحدہ کو یہ باور نہ کرایا ہو کہ پائیدار ترقی کیا ہے اور اجتماعی فلاح کیسے ممکن ہے۔ مثال کے طور پر 2014 میں ایشیاء کی سطح پر ہونے والی پائیدار ترقی کی کانفرنس میں سماجی تنظیموں کی طرف سے مفصل تجاویز پر مبنی دستاویز تیار کیے گئے۔ ان تجاویز کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔[3]

سب سے پہلے تو یہ کہا گیا کہ پائیدار ترقی کو ''ترقیاتی انصاف'' کے نظریہ کے تحت تشکیل دیا جائے۔ ترقیاتی انصاف کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

1۔ وسائل کی منصفانہ تقسیم۔
2۔ اقتصادی انصاف۔
3۔ سماجی انصاف۔
4۔ ماحولیاتی انصاف۔
5۔ عوام کو جوابدہی۔

وسائل کی منصفانہ تقسیم

وسائل کی منصفانہ تقسیم سے مراد؛ حکومتوں کا ایسی پالیسی اپنانا ہے جس سے وسائل، طاقت، دولت اور مواقع ممالک کے اندر، ممالک کے درمیان بشمول عورتوں اور مردوں اور دیگر سماجی گروہ میں عدم مساوات کو لازماً کم کرے۔

اقتصادی انصاف

اقتصادی انصاف سے مراد؛ حکومتیں ایسی معیشتوں کا قیام عمل میں لائیں جس سے باوقار زندگی، ضرورتوں کی تکمیل، صلاحیتوں میں اضافہ، ترقی، تمام افراد کو روزگار کی فراہمی جو نہ تو انسانوں اور نہ ہی قدرتی وسائل اور ماحولیاتی بگاڑ کی بنیاد پر ہو۔ ایک ایسا طریقہ کار جس میں معیشتیں انسانوں کے کام میں آئیں نہ کہ انسان معیشتوں کے۔

سماجی انصاف

سماجی انصاف سے مراد؛ حکومتیں تمام اقسام کے امتیازی سلوک، پس ماندگی اور تشدد جو ہماری آبادیوں میں سرایت کر گیا ہے کا خاتمہ یقینی بنائے اور تمام قوموں کے لیے انسانی حقوق خصوصاً عورتیں، بیوہ، نچلی زات کے ہندو، قدیم افراد، پناہ گزین، بچے، نوجوان،

بوڑھے افراد، معذور افراد اور ایڈز میں مبتلا افراد کے حقوق لازمی قرار دے۔

ماحولیاتی انصاف

ماحولیاتی انصاف سے مراد حکومتیں لوگوں کا مقامی اور عالمی کامنز یعنی دریا، پہاڑ، جنگلات یعنی وہ قدرتی وسائل پر کا اختیار تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی پالیسیاں اور اقدامات نہ کرے جو آنے والی نسلوں کو ایسا ماحول فراہم کرے جو ان کی ترقی اور خوشحالی میں رکاوٹ پیدا کرے۔

عوام کو جوابدہی

عوام کو جوابدہی سے مراد جمہوری اور انصاف پر مبنی حکومت، شفاف حکمرانی جو عوام کو حقائق کی بنیاد پر اپنی زندگیوں، آبادیوں اور مستقبل کے لیے فیصلہ سازی میں مددگار ثابت ہوں۔

ایسا لگتا ہے کہ اقوام متحدہ نے تمام طبقات کو تسلی دینے کے لیے عوامی گروہوں کے الفاظ کو تو مسودہ میں جگہ دے دی مگر اس کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا ورنہ پائیدار ترقی میں ان اداروں مثلاً عالمی مالیاتی ادارے، نجی شعبہ، سرمایہ کار جیسے عوام دشمن، ماحول دشمن گروہوں جو کہ دراصل دنیا میں عدم مساوات اور حقیقی ترقی میں رکاوٹ ہیں کو اس عمل کا حصہ نہ بناتا۔

ایک خیال یہ ہے کہ اقوام متحدہ نے مرض کی وجوہات کا علم ہونے کے باوجود جان بوجھ کر مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کیا ہے کیونکہ دنیا میں غربت میں اضافہ، بھوک میں اضافہ اور ماحولیاتی بحران سرمایہ دارانہ نظام کا ایک ایسا تحفہ ہے جس سے چھٹکارا صرف اس نظام کے خاتمہ سے ممکن ہے۔ اسی لیے دنیا بھر کے عوامی گروہوں کا مطالبہ تھا کہ نظام کی تبدیلی کے بغیر پائیدار ترقی کا خواب کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔

کچھ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ پائیدار ترقی کے اہداف کا تعین انسانی حقوق کی وکالت کرنے والوں کے لیے ایک کامیابی ہے لیکن ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ ہماری زیادہ تر بنیادی توقعات پوری کرنے میں ناکام ہوا ہے۔ تغیراتی تبدیلی کے لیے پائیدار ترقی کے اہداف کی بنیاد صنعتی پیداوار وکھپت اور برآمدات پر مبنی اقتصادی بڑھوتری کے پرانے طریقوں پر ہی مبنی ہے۔4

ایجنڈہ 2030 پر مختلف پہلوؤں پر تبصرہ تو کیا جاسکتا ہے پر اس میں کوئی شک نہیں کہ ایجنڈہ 2030 دراصل دنیا میں سامراجی غلبہ کو مزید تقویت پہنچاتا ہے۔ کیونکہ یہ وسائل کی منصفانہ تقسیم کے بجائے سرمایہ کاروں کے مدد سے غربت اور بھوک کے خاتمہ کی تجویز پیش کرتا ہے اور کسے نہیں معلوم کے سرمایہ کاری صرف اور صرف منافع کمانے کے لیے کی جاتی ہے نہ کہ عوامی مفاد یا ترقی کی خاطر۔

ایک طرف ایجنڈہ 2030 کا مسودہ تفریق اور امتیاز سے پاک طریقہ کار (Inclusive) پر بہت زور دیتا ہے مگر دوسری طرف زمینی حقائق یہ ہیں کہ بہت ساری عالمی سرگرمیاں ایسی بھی ہیں جو پائیدار ترقیاتی اہداف یا پھر مجموعی طور پر ایجنڈہ 2030 سے متصادم ہیں۔ مثال کے طور پر امریکی ایما پر ہونے والا ٹرانس پیسفک پارٹنرشپ (TPP) کا تجارتی معاہدہ جو دنیا کے 17 ممالک کے درمیان ہے۔ اس معاہدہ کا اہم ترین مقصد امریکی مصنوعات کا عالمی منڈی تک پھیلاؤ ہے۔ اس معاہدے میں شامل چھوٹے ممالک مثلاً میکسیکو، پیرو، ویت نام، چلی، برونائی جیسے ملکوں کی اقتصادی ترقی امریکی مفادات کے مرہون منت ہو کر رہ جائے گی۔ امریکی تجارتی مفادات کے زیر سایہ اس معاہدہ سے ان ممالک کے مزدوروں کے روزگار کو شدید خدشات لاحق ہیں۔ اسی طرح ڈبلیو ٹی او کے تحت ایسے قوانین کا نفاذ یقینی بنایا جارہا ہے جس سے صرف ترقی یافتہ ممالک کی معیشتوں کو فروغ حاصل ہوسکے گا اور نتیجہ میں ترقی پزیر ممالک میں پیداواری صنعتوں کا زوال اور بڑے پیمانے پر معاشی عدم استحکام کا خطرہ ہے۔ ایسے میں ایجنڈہ 2030 کا ''کوئی پیچھے نہ رہے'' نو ون بی ہائنڈ (No One Behind) کا نعرہ بے معنی نظر آتا ہے۔ امریکہ اور دیگر ترقی یافتہ حکومتیں اپنے ہمنوا ادارے مثلاً ڈبلیو ٹی او دنیا کی کثیر آبادی اور پسے ہوئے طبقات کو ہمیشہ کے لیے پیچھے رکھنے کے لیے دانستہ چالیں چل رہی ہیں۔ اسی لیے دنیا میں ایسے طبقات یا گروہ جو مزاحمتی نظریہ رکھتے ہیں کے خیال سے جب تک منافع کی بنیاد پر ترقی کے بنیادی عناصر جس کی بنیاد سرمایہ داری ہے کا خاتمہ نہیں ہوگا کسی قسم کی بھی مثبت پائیدار ترقی ناممکن ہے۔

ایجنڈہ 2030 پائیدار ترقی کی نفی ہے کیونکہ اس میں بڑی بڑی جاگیروں کو منصفانہ اور مساویانہ بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی بلکہ عملی طور پر تو اس کا الٹ ہورہا ہے۔ بڑے پیمانے پر زرعی زمینوں پر سرمایہ کار کمپنیاں قبضہ جما رہی ہیں جس کی وجہ سے مقامی کسانوں کے روزگار کے ساتھ ساتھ خوراک کی پیداوار کو بھی شدید خطرات لاحق ہیں۔

ایجنڈہ 2030 پائیدار ترقی کی نفی ہے کیونکہ اس میں دنیا کی بڑی بڑی دیو ہیکل کمپنیوں کے عالمی منڈی پر غلبہ کو توڑنے کے لیے کوئی حل پیش نہیں کیا گیا بلکہ خیال یہ ہے کہ انہیں مزید مستحکم کیا گیا ہے۔ جب انسانوں کے حقوق پر کمپنیوں کے حقوق کو فوقیت دی جائے گی تو کیونکر انسانی ترقی ممکن ہوسکے گی؟

ایجنڈہ 2030 اس لیے بھی پائیدار ترقی کی نفی کرتا ہے کہ اس میں صنعتی طریقہ پیداوار کے بدلے متبادل طریقہ پیداوار تجویز نہیں کیا گیا جس میں پیداواری وسائل مکمل طور پر پیدا کرنے والوں کے اختیار میں ہوں۔ خصوصاً زراعت کے حوالے سے پائیدار زراعت کے فروغ اور کیمیائی کھاد، زہریلی ادویات کے ساتھ ساتھ جینیاتی بیجوں پر پابندی کی کوئی صلاح اس مسودے میں شامل نہیں۔

ایجنڈہ 2030 پائیدار ترقی کی نفی کرتا ہے کیونکہ اس کی تیاری میں حقیقی عوامی مشاورت کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا گیا، جہاں پسے طبقات اپنی آواز اور

مسائل اس عمل میں شامل کروا سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ ایجنڈہ 2030 سرمایہ دارانہ مفادات کو آگے بڑھاتے ہوئے آزاد تجارت کی راہ ہموار کرتا ہے جس سے سامراجی گرفت مزید مضبوط ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقی عوامی مشاورت اور شمولیت کے بغیر تیار ہونے والا کوئی بھی مسودہ یا عالمی اعلامیہ جیسے ایجنڈہ 2030 عوامی گروہوں، پسے ہوئے طبقات کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہوگا۔

حوالہ جات

1. United Nations Sustainable Development Knowledge Platform. "Transforming our world: the 2030 Agenda for Sustainable Development." Accessed from: https://sustainabledevelopment.un.org/post2015/transformingourworld
2. IBON International Update. "The Sustainable Development Goals: Now Offer for Business." SusDev # 3, September 29, 2015. Accessed from http://iboninternational.org/article/2015/10/unsustainable-development-goals-now-open-business
3. Social Watch. "Advancing People's Agenda for Development Justice." May 30, 2114. Accessed from: http://www.socialwatch.org/node/16450
4. Center for Economic and Social Rights. "UN adopts Agenda 2030, but will governments follow through?" CESR Statement. Accessed from http://www.cesr.org/downloads/Agenda2030_CESR_statement.pdf

(بقیہ حوالہ جات: پیرس کلائمٹ معاہدہ: ایک تنقیدی جائزہ)

18. UNFCCC. "Slow onset events: technical paper." FCCC/TP/2012/7.
Accessed from http://unfccc.int/resource/docs/2012/tp/07.pdf, p. 3.
19. Mandel, Kyla. "Why is loss and damage a big deal at the Paris climate talks." Greenpeace Energy Desk, December 9, 2015. Accessed from http://energydesk.greenpeace.org/2015/12/09/why-is-loss-and-damage-a-big-deal-at-the-paris-climate-talks/
20. UNFCCC. "Adoption of the Paris Agreement," p. 28.
21. World Maritime News. "Shipping dropped from Paris climate deal." December 10, 2015. Accessed from http://worldmaritimenews.com/archives/178438/shipping-dropped-from-paris-climate-deal/
22. Ibid.
23. Seas at Risk. "Paris climate target 'impossible' without curbing shipping emissions - NGOs." February 9, 2016. Accessed from http://www.seas-at-risk.org/18-shipping/624-paris-climate-target-impossible-without-curbing-shipping-emissions-ngos.html
24. ship-technology.com "Mega shippers - the world's 10 biggest shipping companies." February 24, 2015, Kable. Accessed from http://www.ship-technology.com/features/featuremega-shippers---the-worlds-10-biggest-shipping-companies-4518689/
25. Riebeek, Holli. "Global warming." NASA, Earth Observatory, June 3, 2010. Accessed from http://earthobservatory.nasa.gov/Features/GlobalWarming/page2.php
26. Ibid.
27. Kreft, S. et al. "Global climate risk index 2015: Who suffers most from extreme weather events? Weather-related loss events in 2013 and 1994 to 2013." German Watch. Accessed from https://germanwatch.org/en/download/10333.pdf
28. Rana, Shahbaz. "Pakistan's external debt set to grow to whopping $90 billion." The Express Tribune, Decmeber 13, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/1009032/in-the-next-four-years-pakistans-external-debt-set-to-grow-to-whopping-90b/

(بقیہ حوالہ جات: نیسلے پاکستان کا جائزہ)

70. Zeratsky, Katherine. "Nutrition and healthy eating: What is BPA, and what are concerns about BPA?" Mayo Clinic, May 21, 2013. Accessed from http://www.mayoclinic.org/healthy-lifestyle/nutrition-and-healthy-eating/expert-answers/bpa/faq-20058331
71. MCPS. "The life of plastic bottle." MCPS.
72. Ahmad, Jawad. "Top milk producing countries of the world." Veterinary Hub, May 3, 2013. Accessed from http://www.veterinaryhub.com/top-milk-producing-countries-of-world/
73. Nestle Pakistan. "Project WET." Nestle Pakistan. Accessed from http://www.nestle.pk/csv/water/project-wet
74. Food & Biotechnological Research Centre. "Collaborative Industries." PCSIR, Ministry of Science & Technology, Govt. of Pakistan. Accessed from http://www.pcsir.gov.pk/fbrc.html
75. Nestlé. "Nestlé and Water: Sustainability, Protection, Stewardship." Nestle, p. 63. Accessed from http://www.nestle.it/asset-library/documents/pdf_nostri_report/23_nestle_water1.pdf
76. Rosemann, Nils. "Drinking water crisis in Pakistan and the issue of bottled water." P. 19.
77. Ibid, p. 22.
78. Bottled life. "Bottled life: The truth about Nestle's business with water." Bottled life, 2011. Accessed from http://www.bottledlifefilm.com/index.php/the-story.html
79. Corporate Watch. "Illegal extraction of groundwater." Corporate Watch. Accessed from https://corporatewatch.org/company-profiles/nestl%C3%A9-sa-corporate-crimes#water
80. Corporate Watch. "Unethical marketing of artificial baby milk." Corporate Watch, June 10, 2015. Accessed from https://corporatewatch.org/company-profiles/nestl%C3%A9-sa-corporate-crimes
81. Campaign for Ethical Marketing. "Nestle still the worst of the baby food companies." Baby Milk Action. Accessed from http://archive.babymilkaction.org/CEM/compjune04.html#3
82. Campaign for Ethical Marketing. "How Nestle uses the 'breast is best' notice to endorse its breastmilk substitutes." Baby Milk Action. Accessed from http://archive.babymilkaction.org/CEM/compjunejuly01.html
83. Corporate Watch. "Exploiting farmers." Corporate Watch. Accessed from https://corporatewatch.org/company-profiles/nestl%C3%A9-sa-corporate-crimes#farmers
84. Nguyen, Katie. "Nestle admits to slave labor, may prompt other companies to come clean." Huffpost Impact, Huffington Post, November 25, 2015. Accessed from http://www.huffingtonpost.com/entry/nestle-admits-to-using-slave-labor-groups-hope-other-companies-will-come-forward_5655cec6e4b08e945fea9729
85. Corporate Watch. "Union busting." Corporate Watch. June 10, 2005. Accessed from https://corporatewatch.org/company-profiles/nestl%C3%A9-sa-corporate-crimes#union

ڈبلیو ٹی او کا دسواں وزراتی اجلاس: خدشات

تحریر: گوہر امان

15-18 دسمبر 2016 کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (World Trade Organization/WTO) کا دسواں وزراتی اجلاس کینیا کے شہر نیروبی میں منعقد ہوا۔ ڈبلیو ٹی او ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو عالمی تجارت کے لیے قوانین اور طریقہ کار وضع کرتا ہے۔ اس ادارے کے بارے میں عوامی گروہوں کی رائے اچھی نہیں اور اسے ایک متنازع ادارے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک اور عوام دوست گروہ خصوصاً کسان آبادیاں اس ادارے کو ایک جانبدار ادارہ قرار دیتی ہیں کیونکہ اس کی پالیسیاں زیادہ تر امیر سرمایہ دار ممالک کے کاروبار اور مفاد کو بڑھاوا دینے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ بلکہ بعض تو اسے سرمایہ داری اور اس کے جبر کو بڑھانے کا سب سے بڑا ہتھیار سمجھتے ہیں۔

ویسے تو WTO (ڈبلیو ٹی او) کے بہت سے پہلو اور شعبے ایسے ہیں جن پر ترقی پذیر ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان سخت اختلافات نظر آتے ہیں مگر خاص کر زراعت ایک ایسا شعبہ ہے جس کی وجہ سے دونوں گروہوں میں شدید تنازعہ دیکھنے میں آتا ہے۔ ڈبلیو ٹی او کے خلاف عالمی مزاحمت میں بھی زراعت کا سب سے اہم کردار ہے۔ اسی لیے آج تک ڈبلیو ٹی او کو اپنی استحصالی پالیسیوں کو پوری طرح نافذ کرنے میں رکاوٹ کا سامنا ہے جس کی سب سے اہم مثال 1999 میں ہونے والا سیاٹل وزارتی اجلاس ہے۔ جہاں ڈبلیو ٹی او مخالف گروہوں نے بھر پور مزاحمت کے ذریعہ ترقی پذیر ممالک کی مدد سے ترقی یافتہ ممالک کے مقاصد کو یکسر مسترد کر دیا۔

سیاٹل کے بعد پے درپے ناکام وزراتی اجلاسوں کے بعد پہلی دنیا کے ممالک خصوصا امریکہ اور یورپ کا بھرپور زور تھا کہ نویں وزراتی اجلاس کو جو انڈونیشیاء کے شہر بالی میں 2013 میں منعقد ہوا تھا ہر صورت کامیاب بنایا جائے تاکہ عالمی تجارت کے لیے قواعد وضوابط وضع کرنے والے ڈبلیو ٹی او کو خاتمے سے بچایا جاسکے۔ اس اجلاس میں بالی پیکیج کا سب سے اہم نکتہ تجارتی سہولیات کا معاہدہ (Trade Facilitation Agreement/TFA) پہلی دنیا کے ممالک کی طرف سے پیش کیا گیا۔ گوکہ یہ بات طے شدہ تھی کہ جب تک دوحہ ترقیاتی فریم ورک (Doha Development Framework/DDF) پر بات چیت مکمل نہ ہو جائے جس میں تیسری دنیا کی زراعت کے لیے چند مثبت پالیسیاں شامل تھیں تب تک کوئی نیا موضوع زیر بحث نہیں لایا جائے گا لیکن امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک نے ترقی پذیر ممالک کو TFA (ٹی ایف اے) معاہدے کو قبول کرنے پر مجبور کیا اور اس طرح ترقی یافتہ ممالک دوہا ترقیاتی دور کو مکمل کیے بغیر ایک نئے معاہدے کو بات چیت کا حصہ بنانے کے مقصد میں کامیاب ہوگئے۔1

اطلاعات کے مطابق پاکستان نے اکتوبر 2015 میں اس معاہدے پر دستخط کردیے ہیں اور اس طرح پاکستان 50 واں ملک ہے جس نے تجارتی سہولیات کے معاہدے کو باقائدہ تسلیم کیا ہے۔2 ٹی ایف اے معاہدے کا مقصد ممالک کی سرحدوں پر کسٹم کی پیچیدگیوں کو آسان اور تیز رفتار بنانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس معاہدے کا صرف ایک مقصد ہے کہ درآمدی سامان جلد از جلد منڈی تک پہنچ جائے۔ بہت سے ترقی پذیر ممالک خصوصاً بھارت نے دیگر ممالک کے ساتھ مل کر اس معاہدے کی سخت مخالفت کی جبکہ پاکستان نے ترقی یافتہ ممالک خصوصاً امریکہ کی ہمنوائی کرتے ہوئے اس معاہدے کی حمایت کی۔ اس حوالے سے اختلافات کو دور کرنے کے لیے ترقی یافتہ ممالک نے ترقی پزیر ممالک خصوصاً بھارت کو یہ لالچ دی کہ وہ اپنی عوام کے لیے غذا ذخیرہ کرنے کا مطالبہ عارضی طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ جسے ''پیس کلاز'' (Peace Clause) کا نام دیا گیا۔ اس حوالے سے ترقی پزیر ممالک کا مطالبہ تھا کہ یہ سہولت مستقل بنیادوں پر دی جائے جسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ ترقی یافتہ ممالک نے طاقت کے بل پر ترقی پزیر ممالک کو عارضی غذائی ذخیرے کی سہولت کے بدلے تجارتی سہولیات کو مستقل طور پر ڈبلیو ٹی او کا حصہ بنا دیا۔ یہ ابہام کہ ڈبلیو ٹی او تمام ممالک کے لیے یکساں قوانین بناتا ہے، اس مثال کے بعد ختم ہوجانا چاہیے۔ ڈبلیو ٹی او میں بھی وہی جنگل کا قانون ہے یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔

امریکہ کی طرف سے تجارتی سہولیات فراہم کرنے اور انہیں تیز تر کرنے پر زور دینے کی دیگر شکلیں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً امریکی امدادی ادارے یو ایس ایڈ (USAID) نے پاکستان میں پاکستان ٹریڈ پروجیکٹ (Pakistan Trade Project)3 اور افغانستان میں ٹریڈ اینڈ ایکسیشن فسیلیٹیشن فار افغانستان (Trade and Accession Facilitation for Afghanistan)4 منصوبہ 2013 سے ہی شروع کررکھا ہے۔ ان دونوں منصوبوں کا مقصد سرحدوں پر اشیاء اور مال بردار ٹرکوں کی قانونی کاروائی جلد کرنے (کلیئرنس) اور اس حوالے سے کسٹم حکام کی تربیت کرنا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس سرحد پر ایسی تیز تر سہولیات کی فراہمی اس لیے ہے کہ امریکہ اس راستے سے اپنے مصنوعات کی وسطی ایشیاء سے جنوبی ایشیاء تک اور جنوبی ایشیاء سے وسطی ایشیاء تک آمد و رفت کو آسان بنانا چاہتا ہے۔ وگرنہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ

تجارتی سہولیات کے معاہدے کو حتمی طور پر منظور کرنے والے ممالک

ہانگ کانگ چین، سنگاپور، امریکہ، موریشس، ملیشیا، جاپان، آسٹریلیا، باٹسوانا، ٹرینیڈاڈ، ٹابوگو، کوریا، نیکارا گوا، نائیجیر، بالیزے، سوئیزرلینڈ، چائینیز تائیپے، لیچٹنین، لاؤ، نیوزی لینڈ، ٹوگو، تھائی لینڈ، یورپی یونین (28 یورپین ممالک) اور سابقہ یوگوسلاویہ، ریپبلک آف میسیڈونیا۔

ایک ایسے ملک جہاں خاطر خواہ صنعتیں اور پیداوار نہیں اس ملک کی سرحد پر کسٹم قوانین اور انتظامات میں اصلاحات پر اس حد تک زور کیوں دیا جائے؟

دسویں وزراتی اجلاس کا نتیجہ بھی نویں وزراتی اجلاس سے کچھ مختلف نہیں رہا بلکہ اس کے نتائج مزید سنگین نکلنے کے خدشات ہیں۔ اس وزارتی اجلاس میں یہ بات کھل کر کہہ دی گئی کہ ممالک کے درمیان دوہا ترقیاتی دور کو مکمل کرنے کے حوالے سے اختلافات پائے جاتے ہیں اور اختلافات اس حد تک ہیں جسے ختم کرنا ناممکن نظر آتا ہے۔ دوہا راؤنڈ کے حوالے سے کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ نیروبی میں جن مسائل پر بات چیت اور فیصلے ہوئے اور جسے نیروبی پیکج کا نام دیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔[5]

- ترقی یافتہ ممالک کی جانب سے زرعی برآمدات کے لیے زرتلافی کا خاتمہ اور ترقی پذیر ملکوں کے لیے زرعی برآمدات کے لیے زرتلافی میں چھوٹ دی گئی ہے۔
- کچھ ترقی پذیر ملکوں کی طرف سے سرکاری خرچ پر اناج کے خرید اور غریبوں میں تقسیم کے لیے ذخیرہ اندوزی کی اجازت۔ اس اجازت کے ساتھ یہ نقطہ بھی شامل کیا گیا ہے کہ گو کہ خوراک کا تحفظ ایک جائز مقصد ہے، مگر مقررہ نرخ پر سرکاری سطح پر ذخیرہ اندوزی کو تجارتی بگاڑ کے زمرے میں دیکھا جاتا ہے۔
- ترقی پذیر ملکوں کے لیے خصوصی تحفظ کا نظام (Special Safeguard Mechanism/SSM) سے مراد ترقی پزیر ملکوں کو زرعی اشیاء کی اچانک درآمد کے موقع پر درآمدی ٹیکس کو بڑھانے کی اجازت ہے۔
- مقامی مدد اور منڈی تک رسائی۔ مقامی مدد سے مراد گرین، بلیو، ایمبر باکس کے تحت دی جانے والی زرتلافی ہے۔

امریکہ اور یورپ کی طرف سے نیروبی پیکج کو بہت مثبت نتیجہ کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ یورپی تجارتی وزیر سیسیلیا مالم اسٹروم کا کہنا ہے کہ:

”نیروبی پیکج کی بہت ٹھوس علامتی اہمیت ہے۔ ضروری تھا کہ ہم دیکھا سکیں کہ ہم کامیاب ہوئے اور تجارت کے حوالے سے ڈبلیو ٹی او عالمی معاہدوں کے لیے ابھی بھی مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔[6]

عوامی گروہوں اور عوام دوست تجارتی ماہرین کی رائے میں دسواں وزراتی اجلاس ایک ناکام اجلاس تھا جس میں امیر ممالک کو فائدہ حاصل ہوا۔ مزید یہ کہ نیروبی پیکج نے دوہا بات چیت کے دور کا ”عملاً خاتمہ“ کردیا ہے۔[7] سماجی تنظیموں کا یہ بھی کہنا ہے کہ نیروبی پیکج میں ترقی پزیر ممالک کو جو سہولیات دی گئی ہیں وہ اصل میں ایک دھوکہ ہے کیونکہ ترقی پزیر ممالک نے درآمدی سیلاب سے بچنے کے لیے خصوصی حفاظتی اقدامات اور عوامی مفاد کے لیے خوراک کے ذخیرہ کا مطالبہ پہلے ہی کررکھا ہے۔[8]

اسی سال ڈبلیو ٹی او کے قیام کے 20 سال مکمل ہونے پر جشن منایا گیا۔ اس موقع پر کہا گیا کہ ”تجارت کارگر ہے، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ تجارت ترقی بڑھاتا ہے اور غربت میں کمی کی وجہ ہے ... تجارت سرمایہ کاری اور جدت کو فروغ دیتی ہے۔ یہ ملکوں کو سرکاری سطح پر صحت اور ماحولیاتی تحفظ کی پالیسی بنانے کی اجازت دیتی ہے۔ یہ ذہنی ملکیت کو تحفظ دیتی ہے ... تجارت کارگر ہے سب سے کمزور، عورتوں، غریبوں، پسماندہ آبادیوں کے لیے جو کہ ان کی زندگیوں اور روزگار میں بہتری لاتی ہے۔ ان سب کے علاوہ تجارت کارگر ہے کیونکہ یہ سیاسی اور معاشی پائیداری مہیا کرتی ہے۔[9]

اس کھلے جھوٹ اور تضاد پر کون نہ مرجائے۔ ڈبلیو ٹی او کے تحت تجارت کارگر نہیں کیونکہ پچھلے 20 سالوں میں غربت اور بے روزگاری میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ تجارت کارگر نہیں کیونکہ اس سے صرف چند مخصوص طبقات کو ہی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ تجارت اس لیے بھی کارگر نہیں کہ یہ سرکاری صحت، تعلیم جیسی بنیادی سہولیات کو نجی شعبہ کے بے رحم ہاتھوں میں دیتی ہے۔ تجارت کارگر نہیں کیونکہ اس میں ذہنی ملکیت کے حقوق کے ساتھ کمپنیاں اپنی من مانی کرتی ہیں اور نتیجے میں عوام کو سخت مہنگائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً دوائیوں کی قیمتوں میں روز بروز ہوش روبا اضافہ بہت بڑی آبادی کو صحت کے حصول سے دور کردیتا ہے۔ تجارت کارگر نہیں کیونکہ یہ سب سے کمزور طبقہ عورتوں، غریبوں، پس ماندہ آبادیوں کے لیے ذلت بھری زندگی، بھوک و افلاس، مفلسی اور بے روزگاری کا باعث ہے۔ ان سب کے علاوہ تجارت اس لیے بھی کارگر نہیں کہ سیاسی اور معاشی عدم استحکام کا باعث بنتا ہے۔

حوالہ جات

1. Chowdhury, Jhinuk. "How much of a winner is India in WTO trade facilitation agreement?" RT Question More. December 11, 2014. Accessed from https://www.rt.com/op-edge/213671-india-wto-trade-winner/
2. WTO. "Pakistan ratifies Trade Facilitation Agreement." WTO: 2015 News Item, October 27, 2015. Accessed from https://www.wto.org/english/news_e/news15_e/fac_27oct15_e.htm
3. USAID, "Pakistan Trade Project." September 26, 2013. Accessed from https://www.usaid.gov/sites/default/files/documents/1871/Trade.pdf
4. USAID, "Trade and Accession Facilitation for Afghanistan (TAFA)." September 30, 2013. Accessed from https://www.usaid.gov/news-information/fact-sheets/trade-and-accession-facilitation-afghanistan-tafa
5. The World Post, "The 10th WTO Ministerial Conference in Nairobi - a successful turning point for the multilateral trading system." January 7, 2016. Accessed from http://www.huffingtonpost.com/ambassador-amina-mohamed/the-10th-wto-ministerial-_b_8859162.html
6. Malmstrom. Cecilia. "What's next for the WTO?" European Commision Speech, January 23, 2016. Accessed from http://trade.ec.europa.eu/doclib/docs/2016/january/tradoc_154177.pdf
7. The Hindu: "Government to respond to WTO's 'Nairobi Package' in Parliament." New Delhi, December 20, 2015. Accessed from http://www.thehindu.com/business/Industry/wto-nairobi-meeting-government-to-respond-to-wtos-nairobi-package-in-parliament/article8011127.ece
8. IBON International "WTO Nairobi Declaration: Death certificate for the Doha Development Mandate." December 21, 2015. Accessed from http://iboninternational.org/article/2015/12/wto-nairobi-declaration-death-certificate-doha-development-mandate
9. Organization. "Public Forum 2015 theme: Trade works." The World Trade Organization. Accessed from https://www.wto.org/english/forums_e/public_forum15_e/theme_e.pdf

پیرس کلائمٹ معاہدہ: ایک تنقیدی جائزہ

تحریر: عذرا طلعت سعید

موسمی تبدیلی کے حوالے سے پیرس کلائمٹ چینج کانفرنس 30 نومبر سے 12 دسمبر، 2015 تک فرانس کے شہر پیرس میں منعقد ہوئی۔ یہ کانفرنس اقوام متحدہ کے فریم ورک کنونشن برائے موسمی تبدیلی کے حامی ممالک کے اکیسویں اجلاس (کوپ 21) کے زیر سایہ منعقد کی گئی۔ اس مضمون کا مقصد کوپ 21 میں طے کیے گئے معاہدے جسے پیرس معاہدہ کہا جارہا ہے پر معلومات فراہم کرنا اور تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔

موسمی تبدیلی کے حوالے سے لائحہ عمل کے لیے فریم ورک کنونشن برائے موسمی تبدیلی (United Nations Framework Convention on Climate Change/UNFCCC) جس کے زیر سایہ پیرس معاہدہ طے پایا ہے پر تفصیلات چیلنج کے پچھلے شمارے میں پیش کی گئیں تھی۔[1]

پیرس معاہدہ کو 195 ممالک نے 12 دسمبر، 2015 کو منظور کیا اور موسمی تبدیلی کے حوالے سے یہ پہلا معاہدہ ہے جس کو عالمی سطح پر قانوناً منظور کیا گیا ہے۔ پیرس معاہدہ کیوٹو پروٹوکال کی جگہ لے گا اور 2020 میں نافذ کیا جائے گا لیکن اس سے پہلے معاہدہ نیو یارک، امریکہ میں اقوام متحدہ کے حوالے ہوگا جو کہ اس کو 22 اپریل، 2016 میں ممالک کے دستخط کے لیے ایک سال کے وقفے کے لیے پیش کرے گا۔[2] یہ معاہدہ اس وقت نافذ العمل ہوگا کہ جب ایسے 55 ممالک جو کہ عالمی اخراج کے 55 فیصد کے ذمہ دار ہیں نے معاہدہ کو منظور کرنے کے لیے متعلقہ دستاویز اقوام متحدہ کو جمع کروا دیے ہوں۔[3]

پیرس معاہدہ گو کہ ایک قانونی معاہدہ ہے پر اس کے کچھ حصے ہی ممالک کے لیے قانونی طور پر نافذ العمل ہیں۔ اسی لیے اس معاہدہ کو ہائبرڈ (hybrid) معاہدہ یعنی قانونی اور رضا کارانہ ذمہ داریوں کا ملاپ کہا جارہا ہے۔ معاہدے میں قانوناً نافذ العمل حصہ کو الفاظ ''کیا جائے گا'' (shall) سے پہچانا جاسکتا ہے۔ جبکہ رضا کارانہ حصے کو ''کیا جانا چاہیے'' (should) کے الفاظ سے پہچانا جاسکتا ہے۔ معاہدے پر رضا مندی کے لیے ایک خاص نقطہ کو اہمیت دی گئی کہ ایسا معاہدہ بنایا جائے جو حکومتی سربراہ قومی اتفاق رائے حاصل کیے بغیر منظور کرسکیں۔ اس نقطے پر سب سے زیادہ زور امریکہ کا تھا۔ ایسے معاہدے کے لیے ضروری تھا کہ ممالک کے لیے کاربن گیسوں کے اخراج کے لیے کوئی مقررہ پابندیاں نہ ہو اور نا ہی موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے نئی مالیاتی اصلاح کے لیے کوئی ہدف مقرر کیا گیا ہو۔[4]

UNFCCC (یو این ایف سی سی سی) کا خیال ہے کہ پیرس معاہدے اور اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے موسم سے حاصل کردہ نتائج (outcomes) وہ تمام اہم ترین اہداف پورے کرتے ہیں جو کہ اس معاہدے کو ایک سنگ میل معاہدے کی حیثیت دیتا ہے۔[5] یہ اہم ترین عناصر مندرجہ ذیل ہیں:

- گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو کم کیا جائے گا (mitigation)۔
- شفافیت کے نظام اور عالمی جائزہ کے لیے کاروائی۔ (transparency system and global stock-take)
- موسمی حالات سے نمٹنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا جائے گا (adaptation)
- نقصانات اور تباہی (loss and damage)۔
- مالیاتی امداد۔

گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو کم کیا جائے گا[6]

پیرس معاہدہ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی کو ایک طویل مدتی ہدف مانتا ہے۔ درجہ حرارت کو صنعتی دور سے پہلے پائے جانے والے درجہ حرارت سے دو ڈگری سینٹی گریڈ کم کیا جائے گا اور کوشش رہے گی کہ اس حد کو 1.5 ڈگری سنٹی گریڈ تک محدود کردیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ عالمی سطح پر ہونے والے کاربن اخراج کی سب سے اونچی سطح کو جلد از جلد حاصل کرلیا جائے۔ ایک دفعہ اخراج کی حد کو چھو لیا جائے تو پھر بہتر سائنس کا استعمال کرتے ہوئے اخراج کو کم کرنے کے لیے جلد از جلد اقدامات اٹھائے جائیں۔ اس نقطے پر اتفاق تھا کہ بحرحال اخراج کم کرنے کی حد کو حاصل کرنے میں تیسری دنیا کے ممالک کو زیادہ وقت درکار ہوگا۔

کوپ 21 کے انعقاد سے پہلے کئی سالوں سے شدید بحث جاری تھی کہ کاربن گیسوں کے اخراج کو اس حد تک کم کیا جائے کہ دنیا کے بڑھتے ہوئے درجہ حرارت کو صنعتی دور سے پہلے پائے جانے والے درجہ حرارت کی سطح سے حد سے حد دو ڈگری سینٹی گریڈ تک محدو کیا جاسکے۔ اس نقطے پر امید سے بڑھ کر وعدے کیے گئے ہیں۔ یعنی دو ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی حد کم کرنے پر اتفاق ہے۔

اس نقطے کے علاوہ اگر گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو کم کرنے کے اقدامات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو واضح ہے کہ اخراج کم کرنے کا ہر فیصلہ پہلی دنیا کے امیر صنعتی ممالک کو مکمل سہولیات فراہم کرتا ہے۔

پیرس معاہدے نے موسمی تبدیلی پر عمل درآمد کے حوالے سے ایک بہت بڑی تفریق پیدا کی ہے۔ اب تک یو این ایف سی سی سی کے زیر نگرانی پہلی اور تیسری دنیا کے درمیان موسمی تبدیلی کے معاہدوں کے لیے ''کامن بٹ ڈیفرینشی ایٹیڈ'' کے کلیدی اصول کے تحت معاہدوں پر مزاکرات کیے جاتے تھے۔ یعنی تاریخی طور پر کاربن گیسوں کے اخراج سے بڑھنے والے زمینی درجہ حرارت کی ذمہ داری صنعتی ترقی یافتہ ممالک پر عائد کی جاتی تھی۔ اس لیے موسمی بحران سے نمٹنے کی بنیادی اور بڑی ذمہ

داری انہی ممالک کو سونپی جاتی تھی لیکن پیرس معاہدے نے موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے کامن بٹ ڈیفرینشی ایٹیڈ (سی بی ڈی آر) جیسی اہم ترین بنیاد کو ختم کردیا ہے۔ اس کی جگہ کوپ 21 نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب ہر ملک، چاہے وہ تیسری دنیا سے ہو یا پہلی دنیا سے اپنی گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج کو کم کرے گا اور اخراج میں کمی کی حد رضا کارانہ طور پر مقرر کرے گا۔ اس نکتے کو نیشنلی ڈیٹرمائنڈ کونٹری بیوشنز (nationally determined contributions/NDCs) کا نام دیا جاتا ہے یعنی ممالک کے پاس کافی لچک ہے کہ وہ اپنے حالات اور صلاحیت کی بنیاد پر فیصلہ کریں کہ کس حد تک کاربن گیسوں کا اخراج کم کیا جائے۔ یعنی ایک طرف اب تیسری دنیا کے ممالک پر بھی یہ شرط عائد ہے کہ وہ کاربن اخراج کم کریں اور دوسری طرف وہ امیر صنعتی ممالک جو زمینی درجہ حرارت میں اضافے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں اپنے ممالک کی صنعتی پیداوار کو محفوظ کرتے ہوئے اپنی مرضی کے مطابق کاربن اخراج کم کر پائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں پیرس معاہدے کے تحت قانوناً کسی بھی ملک پر کاربن گیسوں کے اخراج میں کمی کی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ پیرس معاہدہ خود یہ واضح کرتا ہے کہ فی الحال دیے گئے NDCs (این ڈی سیز) جو پیرس کانفرنس سے پہلے یا اس کے دوران ممالک کی جانب سے جمع کرائے گئے ہیں، عالمی درجہ حرارت کو دو ڈگری سینٹی گریڈ سے کم رکھنا ممکن نہیں ہے۔[7] یہی وجہ ہے کہ پیرس معاہدہ اخراج کم کرنے کے حوالے سے ایک بے بنیاد اور غیر موثر معاہدہ ہے، آنے والے سالوں میں ممالک جو عملی اقدامات کریں گے دراصل وہی تعین کریں گے کہ کاربن اخراج کس حد تک کم کیا گیا ہے۔

• شفافیت کے نظام اور عالمی جائزہ کے لیے کاروائی

عالمی جائزے کے لیے کاروائی (گلوبل اسٹاک ٹیک) کا ذکر پیرس معاہدے کی شق 14 میں کیا گیا ہے۔[8] پہلا گلوبل سٹاک ٹیک 2023 میں منعقد کیا جائے گا۔ اس کے بعد ہر پانچ سال کے وقفے سے منعقد ہوگا۔

گلوبل اسٹاک ٹیک کا بنیادی مقصد موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے کی جانے والی کاروائی کا احاطہ اور جائزہ لینا ہے اور اس پر عمل درآمد کے لیے فیصلہ کیا گیا ہے کہ[9] حکومتیں ہر پانچ سال پر اکھٹی ہوں گی تاکہ موسمی تبدیلی پر سائنسی معلومات کے تحت کاربن اخراج کم کرنے کے لیے نئے اہداف یعنی نئے این ڈی سیز کا چناؤ کیا جائے۔

اکھٹے ہونے کا دوسرا مقصد یہ بھی ہوگا کہ حکومتیں ہر پانچ سال بعد اپنے اخراج کم کرنے کے اہداف یعنی این ڈی سیز پر عمل درآمد کی رپورٹ ایک دوسرے کو اور عوام کو بھی دیں گی۔

تیسرا مقصد ہوگا کہ شفافیت اور جوابدہی کے نظام کو اپناتے ہوئے اس طویل مدتی ہدف میں حاصل ہونے والی کامیابی کو ناپا جائے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے پیرس معاہدہ اسی وقت لاگو ہوگا جب اس پر کم از کم 55 ایسے ممالک دستخط کردیں اور معاہدے کو ماننے کی رضامندی کا اظہار کردیں جو کل اخراج کے 55 فیصد کے ذمہ دار ہیں۔ پیرس معاہدہ 2020 میں لاگو ہوگا۔ معاہدہ لاگو ہونے سے پہلے کے دورانیہ کے لیے ایک اور طریقہ کار بھی واضح کیا گیا ہے۔ اس طریقہ کار کو "فیسی لیٹیٹیو ڈائلاگ" (facilitative dialogue) کا نام دیا گیا ہے یعنی ممالک کے درمیان بات چیت میں مدد یا سہولت فراہم کی جارہی ہے تاکہ معاہدے کے نفاذ سے پہلے کے دورنیے میں موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات سے حاصل کردہ ترقی کا اجتماعی جائزہ لیا جائے۔ پہلی سہولیاتی بات چیت (facilitative dialogue) 2018 میں منعقد کی جائے گی۔ کچھ ممالک کے پیش کردہ این ڈی سیز 2025 تک ختم ہو جائیں گے۔ مثال کے طور پر امریکہ پر "زور" دیا گیا ہے کہ وہ اپنے "نئے" این ڈی سیز 2020 تک فراہم کرے۔ جبکہ جن ممالک کے این ڈی سیز 2030 تک ختم ہوجائیں گے ان سے بھی "درخواست" کی گئی ہے کہ وہ بھی نئے این ڈی سیز سے "آگاہ" کریں۔[10]

• موسمی حالات سے نمٹنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا جائے گا

پیرس معاہدہ کی شق 7 ممالک کے لیے موسمی حالات سے نمٹنے کے لیے ہدف واضح کرتا ہے۔ جس کے تحت کچھ اقدامات تجویز کیے گئے ہیں جن میں ممالک کی موسمی تبدیلی کے حوالے سے صلاحیت بڑھانا (adaptive capacity) اور موسمی حالات سے نمٹنے میں حائل مسائل کو کم کرنا[11] (reducing vulnerability) شامل ہے۔ پیرس معاہدے کی شق 7 کہتی ہے کہ موسمی حالات سے نمٹنے کے لیے لائحہ عمل ملکی سطح پر ہوں، اقدامات مرد اور عورتوں میں فرق کو سامنے رکھتے ہوئے کیے جانے چاہیں یعنی عورتوں کی ضروریات کے مطابق بھی ڈھلے ہونے چاہیں۔ اس کے علاوہ اقدامات کے لیے لائحہ عمل مکمل طور پر شراکت اور شفافیت کی بنیاد پر ہو جس میں کمزور گروہوں اور آبادیوں کے علاوہ ماحولیاتی نظام کو مد نظر رکھا گیا ہو۔ ان اقدامات کی رہنمائی بہتر سائنس کے علاوہ موزوع روایتی علم اور مقامی گروہوں (indigenous groups) کے علم سے حاصل کی جائے۔ مزید یہ کہ موسمی حالات سے نمٹنے کی صلاحیت کو متعلقہ سماجی، اقتصادی اور ماحولیاتی پالیسیوں اور عوامل کا حصہ بنایا جائے۔

شق 7 کا چوتھا نکتہ اس بات کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ حالیہ ضرورت کے پیش نظر موسمی حالات سے نمٹنے کی صلاحیت کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اگر اخراج کی سطح کو زیادہ سے زیادہ کم کیا جائے تو موسمی حالات سے نمٹنے کے لیے مزید اقدامات کو کم کیا جاسکتا ہے جو کہ زیادہ اخراجات کے حامل ہیں۔[12]

موسمی تبدیلی پر ہونے والے معاہدے کی منظوری کے لیے اخراج کو کم کرنے اور موسمی حالات سے نمٹنے کے لیے مالی امداد پر تنازع تھا۔ سینٹر فار کلائمٹ اینڈ انرجی سالوشنز کی رپورٹ کے مطابق تیسری دنیا کے غریب ممالک چاہ رہے تھے کہ ان دونوں مقاصد کے لیے امدادی رقم کو مزید بڑھانے کے لیے اطمینان بخش وعدے کیے جائیں جبکہ پہلی دنیا کے امیر ممالک چاہ رہے تھے کہ تیسری دنیا کے قدراً امیر ممالک بھی مالی امداد میں اپنا حصہ ڈالیں۔[13]

گو کہ شق 7 کے پیرا گراف 13 میں تیسری دنیا کے کوپ ممالک کو بین الاقوامی امداد نا صرف مستقل بنیادوں پر بلکہ اس امداد میں اضافہ کیے جانے پر قانوناً رضا مندی دی گئی ہے۔ لیکن شق 9 کے پہلے ہی پیرا گراف میں یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ ترقی یافتہ ممالک موسمی تبدیلی سے نمٹنے اور اخراج کم کرنے کے حوالے سے وہ امداد فراہم کریں گے جس کے وعدے وہ پہلے سے کر چکے ہیں۔14 دوسرے لفظوں میں مالی امداد 2025 تک پہلے کیے گئے معاہدوں کے مطابق رہے گی۔ یعنی پہلی دنیا کے ممالک ہر سال ایک سو بلین ڈالرز فراہم کریں گے۔ 2025 کے بعد ایک دفعہ پھر سے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت کم از کم حد ایک سو بلین ڈالرز سے زیادہ مالی امداد مقرر کریں گے۔ 15

- نقصان اور تباہی (loss and damage)۔

پیرس معاہدے کی شق 8 موسمی تبدیلی سے ہونے والی تباہیوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ تباہیوں کی تفصیل میں شدید موسمی واقعات (extreme weather events) اور موسمی تبدیلی کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہونے والے واقعات (slow onset events) شامل ہیں۔

اب تک جو زمینی درجہ حرارت بڑھ چکا ہے اس کی وجہ سے کئی شدید تباہیوں کا امکان ہے جن سے کئی سطحوں پر نقصان ہوگا۔ ان میں اقتصادی نقصان، ماحولیاتی تباہی اور زمین کی تباہی شامل ہے۔ ان آفتوں سے نقصان اور تباہی سے جڑے مسائل کو پیرس معاہدہ وارسا انٹرنیشنل میکنیزم فار لاس اینڈ ڈیمیج (Warsaw International Mechanism for Loss and Damage) کے زیر سایہ لایا ہے۔ وارسا میکنیزم یو این ایف سی سی سی کے 2013 کے اجلاس کوپ 19 میں عارضی بنیادوں پر بنایا گیا تھا اور اسے ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ ان ممالک کے لیے جو شدید یا دھیرے دھیرے ہونے والے موسمی واقعات (مثلاً سمندری سطح کا بڑھنا) اور اثرات سے محفوظ نہیں رکھے جاسکتے ان کے لیے ایسے طریقے کار تشکیل دیں جن سے یہ ممالک خود کو سنبھال سکیں۔ 16 پیرس معاہدہ کے تحت وارسا طریقہ عمل کو ذمہ داری دی گئی ہے وہ ایک ٹاسک فورس (task force) تشکیل دے جو یو این ایف سی سی سی کے زیر سایہ تمام منسلک اداروں اور ماہرین کے گروہوں کے علاوہ دیگر گروہوں سے بھی تمام معلومات اکھٹی کرے تاکہ تمام حکومتیں اس حوالے سے اپنے لیے نقصانات سے نمٹنے کے لیے تجاویز تیار کرسکیں۔

پیرس معاہدے کی شق 8 نقصان اور تباہی پر شراکت داری کے لیے 8 شعبہ جات کی نشاندہی کرتی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:17

a۔ ہنگامی حالات کے لیے فوری انتباہی نظام (early warning System)۔

b۔ ہنگامی حالت کے لیے تیاری۔

c۔ موسمی تبدیلی کی وجہ سے آہستہ آہستہ ہونے والے واقعات جو بذات خود ایک لمبی فہرست ہے۔ اس میں شامل ہیں سمندری سطح کا بڑھنا، سمندروں کی بڑھتی ہوئی تیزابیت، بڑھتا ہوا زمینی درجہ حرارت، برف کے تودوں کا پگھلنا اور اس کی وجہ سے اثرات، نمکیات کا بڑھنا، زمین اور جنگلات کا گھٹنا، حیاتیاتی تنوع کا نقصان اور بڑھتے ہوئے صحرا۔ 18

d۔ ایسے واقعات جو مستقل اور نا قابل تلافی نقصان اور تباہی کے حامل ہوں۔

e۔ خدشات کی جامع تشخیص اور ان کا انتظام۔

f۔ خدشات کے لیے بیمہ سہولیات اور دیگر بیمہ پر مبنی حل۔

g۔ غیر معاشی نقصانات۔

h۔ آبادیوں، روزگار اور ماحولیاتی نظام میں لچک (resilience)۔

نقصان اور تباہی پر مبنی شق کی وضاحت کے لیے مخصوص احکامات بھی دیے گئے ہیں کہ ”شق 8 (موسمی تبدیلی سے ہونے والی تباہی کے لیے) کسی ذمہ داری، جواب دہی یا تلافی دینے کے لیے کوئی بنیاد نہیں فراہم کرتی۔ دراصل یہ ہدایت امریکہ کی قیادت میں پہلی دنیا کے ممالک کے اصرار پر شامل کی گئی تھی۔ ان ممالک کو خدشہ تھا کہ موسمی تبدیلی سے ہونے والی تباہیوں پر ہونے والے اخراجات کا مطالبہ کہیں امیر صنعتی ممالک سے نہ کرلیا جائے۔ ایک اخباری خبر کے مطابق ٹوڈ سٹرن، امریکی خصوصی این وائل نے کلائمٹ کانفرنس کے دوران کہا کہ ”یہ ایک چیز ہے کہ جو ہم اس معاہدے میں نہ مانتے ہیں اور نہ مانیں گے اور وہ یہ خیال ہے کہ نقصان اور تباہی کے لیے تلافی یا مالی واجبات (compensation or liability) دیے جانے چاہئیں“۔19

پیرس معاہدے کی شق 15 ایک نئے طریقہ عمل کی نشاندہی کرتی ہے جس کے تحت اس معاہدے کو لاگو کیا جائے گا اور اس کے بیان کردہ مقاصد پر عمل درآمد کروایا جائے گا۔ یہ طریقہ عمل ایک ماہرین کی کمیٹی پر مبنی ہوگا۔ اس کمیٹی کا کردار سہولت کار کا ہوگا اور کام کا طریقہ شفافیت، بغیر جرمانے اور غیر مخالفانہ رویوں کو اپنائے گا۔20

- مالیاتی امداد

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ مالی امداد پیرس معاہدے کے لیے ایک اہم بنیادی مسئلہ تھی۔ اس حوالے سے معلومات پہلے دے دی گئی ہیں۔ خلاصہ کے طور پر کچھ اہم نکات کو دوبارہ سے بیان کیا جارہا ہے۔

- پیرس معاہدے نے کوئی نئی مالیاتی امداد کی نشاندہی نہیں کی ہے۔
- پچھلے معاہدوں کے تحت امیر ممالک 2025 تک ہر سال ایک سو بلین ڈالرز فراہم کریں گے اور 2025 کے بعد مدد کے لیے نئی مالیاتی امداد جو کہ کم از کم 100 بلین ڈالرز سے زائد ہوگی طے کی جائے گی۔
- تیسری دنیا کے مالیاتی اعتبار سے بہتر ممالک سے بھی گزارش کی گئی ہے کہ وہ اس مد میں امداد فراہم کریں۔

اب تک جو معلومات فراہم کی گئیں ہیں وہ معاہدے میں موجود نکات پر تھیں لیکن ایک

ایک اہم زیر غور نقطہ سمندری اور ہوائی جہاز رانی کے حوالے سے ہے۔ اس شعبہ کو پیرس معاہدے سے باہر رکھا گیا ہے۔ سمندری اور ہوائی جہاز رانی کے شعبہ کو پیرس معاہدے سے باہر رکھے جانے پر بھی تنقید پائی جاتی ہے۔ ایک خبر کے مطابق ''عالمی ہوائی اور سمندری جہاز رانی کو اگر ممالک کی حیثیت میں دیکھا جائے تو پھر یہ شعبے سب سے زیادہ اخراج کرنے والے ممالک کی فہرست میں پہلے دس نمبروں پر نظر آئیں گے''۔ ... سمندری اور ہوائی جہاز رانی کے شعبے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں 80 فیصد اضافہ دیکھا گیا جبکہ عالمی معاشی سرگرمیوں کی وجہ سے کاربن ڈائی آکسائیڈ کے اخراج میں اضافہ 40 فیصد ہے''۔[21]

پیرس معاہدے میں سمندری اور ہوائی جہاز رانی پر جب حد بندی نہ کیے جانے پر یورپی پارلیمان کے رکن ماتھیاس گروٹ کا کہنا تھا کہ سمندری اور ہوائی جہاز رانی پیرس معاہدے سے غائب ہو گئے ہیں۔ ہم دو ڈگری کا ہدف سب سے بڑے اخراج کرنے والوں کو شامل کیے بغیر حاصل نہیں کر سکتے''۔[22] جہاز رانی کا کل عالمی کاربن ڈائی آکسائیڈ اخراج میں تین فیصد حصہ ہے جو کینیڈا، برازیل، انڈونیشیاء، فرانس اور برطانیہ سے زیادہ ہے۔[23]

تجزیہ

پیرس معاہدے کی ناکامی اس مضمون میں درج معاہدے پر تفصیلات سے واضح ہے۔ زمینی درجہ حرارت کے بڑھنے سے موسمی تبدیلی سے پیدا ہونے والی تباہی کئی سطحوں پر ہے۔ اس میں معیشت کی تباہی یا اس کا کمزور پڑنا، ماحولیاتی تباہی، خوراک کا بحران، زرعی پیداواری نظام میں بگاڑ، حیاتیاتی تنوع کی بربادی بالکل واضح ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان سب نقصانات کا سب سے زیادہ سامنا تیسری دنیا کے کمزور ممالک اوران کے عوام کر رہے ہیں۔

زمین کے درجہ حرارت میں اضافے سے کئی طرح کے خطرات پر اب مفصل قابل اعتبار تحقیق موجود ہے۔ یہ لکھنا غلط نہیں ہوگا کہ پیرس معاہدے نے ایک حد تک ساری دنیا کے عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

سمندر رانی اور ہوائی جہاز رانی کو پیرس معاہدے سے باہر رکھنا سرمایہ داری نظام کی بقاء کے لیے نہایت اہم ہے۔ ظاہر ہے دنیا کی تمام تر تجارت ان دو بڑے شعبوں سے جڑی ہے۔ یہ دونوں ابھی تک رکازی ایندھن کے استعمال پر انحصار کرتے ہیں یہاں واضح ہے کہ فی الحال دنیا میں عالمی تجارت ان دو دیوہیکل شعبوں کے بغیر ناممکن ہے اور اس وقت دنیا کے سب سے بڑی سمندری جہازوں کی کارپوریشن امریکہ، جاپان اور دیگر یورپی ملکوں سے تعلق رکھتی ہیں۔[24]

ناسا (National Aeronautics and Space Administration/NASA) جو کہ امریکی حکومت کا ہوائی اور خلائی حوالے سے سائنس اور ٹیکنالوجی کا ادارا ہے،[25] کے مطابق 1906 سے 2005 تک زمینی حدت تقریباً 0.6-0.9 ڈگری سینٹی گریڈ بڑھی ہے۔ کمال ہے کہ خود ناسا مانتا ہے کہ درجہ حرارت رکازی ایندھن کے جلانے سے بڑھ رہا ہے۔ اس ادارے کے مطابق 1750 میں صنعتی انقلاب کے آغاز سے 2009 تک کاربن ڈائی آکسائیڈ کی سطح 38 فیصد اور میتھین گیس کی سطح 148 فیصد بڑھ گئی ہے۔ سمندری سطح 1870 سے لے کر 2000 تک 0.7 فٹ یا 8.7 انچ بڑھ چکی ہے جبکہ 1993 سے 2009 کے وقفہ میں سمندری سطح کے بڑھنے کی رفتار میں مزید تیزی دیکھنے میں آ رہی ہے۔[26]

اس کے علاوہ شدید گرمی کے دنوں میں اضافہ، شدید موسم گرما اور جنگلی آگ، موسم بہار کی آمد اور دورانیے میں تبدیلی اور شدید نوعیت کے طوفانوں کی توقع ہے۔ ان واقعات سے پینے کے پانی اور خوراک کی پیداوار میں کمی، وبائی بیماریوں میں وسعت وہ ساری آفتیں ہیں جو موسمی تبدیلی کے ساتھ آنی شروع ہوچکی ہیں۔ انہی آفات سے ہونے والے ''نقصان اور تباہی'' کا ذکر پیرس معاہدہ بڑی رعونت سے کر رہا ہے بجائے اس کے کہ ان حالات سے نمٹنے کے لیے قانوناً کوئی مفصل تدبیر اور ساتھ ساتھ مالی امداد کے علاوہ نقصان پہنچانے والوں کے خلاف قانونی کاروائی پیش کی جاتی، پیرس معاہدہ صرف باہمی شراکت داری پر مبنی طریقوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔ بلکہ امریکہ جیسے صنعتی ممالک کے دباؤ پر پیرس معاہدے میں صاف لفظوں میں درج کر دیا گیا ہے کہ موسمی تبدیلی سے ہونے والے واقعات کی نا ''ذمہ داری'' اور ناہی ان کے لیے کوئی ''تلافی'' (یعنی مالیاتی امداد) پہلی دنیا کے ممالک فراہم کریں گے۔ اس حوالے سے اگر ہم پاکستان کی حالت پر نظر ڈالیں تو یہ سمجھنے میں مشکل نہیں کہ ہم کس قدر خطرناک دوراہے پر کھڑے ہیں۔

ایک ادارے جرمن واچ کی 2014 میں پیش کردہ تحقیق دنیا میں موسمی بحران کی زد میں آنے والے سب سے زیادہ کمزور ممالک کی فہرست فراہم کر رہی ہے۔[27]

تحقیق نے دو مختلف دورانیے پر مبنی معلومات فراہم کی ہیں۔ پہلی فہرست میں اثرات ناپنے کے لیے جو اشارے استعمال کیے گئے ہیں ان میں کل اموات، ایک لاکھ (100,000) لوگوں میں اموات کی شرح، کل مالی نقصان (امریکی ڈالر)، جی ڈی پی (مجموعی ملکی پیداوار) میں فی یونٹ نقصان اور 1994 اور 2013 کے درمیان ہونے والے کل موسمی واقعات (صرف طوفان، سیلاب، گرم و سرد درجہ حرارت کے شدید واقعات) شامل کیے گئے ہیں۔

اس فہرست میں 2013-1994 کے دوران موسمی تبدیلی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک کی فہرست میں پاکستان دسویں نمبر پر ہے۔ اس دورانیے میں پاکستان 141 شدید موسمی واقعات سے دوچار ہوا ہے۔

یہ تحقیق ایک اور فہرست بھی فراہم کرتی ہے جس میں وہ ممالک شامل ہیں جو 2013 میں موسمی تبدیلی کی وجہ سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اثرات ناپنے کے لیے فہرست اموات، مالی نقصان، مجموعی ملکی پیداوار میں فی یونٹ نقصان اور ہیومن

ڈیولپمنٹ انڈکس (انسانی ترقی کے اشاروں پر مبنی فہرست) شامل کرتی ہے۔ اس فہرست میں پاکستان چھٹے نمبر پر ہے جبکہ اسی فہرست کے مطابق 2012 میں پاکستان تیسرے نمبر پر تھا۔

جرمن واچ کی طرف سے پیش کردہ رپورٹ پاکستان کے لیے نہایت تشویش کا باعث ہے پر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان حالات کا پاکستانی حکومت کو پہلے سے علم نہ تھا۔ پاکستان کے سامنے ماحولیاتی بحران اب صرف خطرہ نہیں بلکہ ایک المناک حقیقت ہے۔ یہاں پر ایک دفعہ پھر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس دیوہیکل مسئلے کی جڑ کیا ہے؟ یقیناً وجوہات رکازی ایندھن کا صنعتی ترقی حاصل کرنے کے لیے بے تحاشہ استعمال ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ صنعتی ترقی پاکستان نے نہیں بلکہ امریکہ اور دیگر سرمایہ دار صنعتی ممالک نے حاصل کی۔ کہانی ''گھسی پٹی'' صحیح لیکن یہ صنعتی ترقی انسانی ترقی کے لیے نہیں کی گئی بلکہ ایک خاص امیر طبقے کی منافع کی چاہ پر مبنی ہے۔ صنعتی ممالک اور پاکستان جیسے غریب زرعی ممالک دونوں میں ایک ایسا امیر ترین طبقہ ہے جس کی منافع کی چاہ اور اس سے حاصل کردہ پر تعیش زندگی کرہ ارض کے اربوں مکینوں کے لیے بھوک، پیاس، بیماری اور شدید سختی کی ضامن ہے۔ دنیا کے بلکتے عوام میں پاکستان کی بھی تقریباً آدھی آبادی اس کسمپرسی کے عالم میں تباہ و برباد ہے۔

پیرس معاہدے میں پہلی دنیا کے امیر صنعتی ممالک نے ابتر موسمی حالات کی تاریخی ذمہ داری سے مکمل ''نجات'' حاصل'' کرلی ہے اور سی بی ڈی آر کا خاتمہ کردیا ہے۔ اب ہر ملک چاہے امیر ہو یا غریب، اپنی مرضی سے اپنا کاربن اخراج کم کرسکتا ہے اور اس پر مزید ڈھٹائی یہ ہے کہ مالی اور جانی نقصان جو شدید اور آہستہ ہونے والے موسمی حالات کی وجہ سے ہونگے، کی ذمہ داری سے بھی مکمل طور پر ہاتھ اٹھا لیا ہے۔ اگلے دس سالوں تک امیر ممالک کی طرف سے فراہم کردہ مالی امداد محدود کردی گئی ہے۔ یعنی پیرس معاہدے کی یہ تشریح غلط نہ ہوگی کہ اس معاہدے نے سرمایہ دار صنعتی ممالک کو ایک طرف اخلاقی ذمہ داری سے بری الذمہ کردیا ہے اور دوسری طرف مالی ذمہ داری کی شرائط کو نہایت نرم کردیا ہے۔

جو کچھ پیرس معاہدے میں ہوا ہے وہ دراصل کوئی نئی چال نہیں۔ اگر پاکستان کی معیشت کا جائزہ لیا جائے تو ہمارا ملک کئی طرح کے بحران کا سامنا کررہا ہے جن میں صنعتی ترقی کا فقدان، زرعی پیداواری شعبے کی تباہی، کم آمدنی پر مبنی تکلیف دہ روزگار، بھوک، غربت اور خوراک کا بحران شامل ہیں۔ ان معاشی و معاشرتی بحرانوں میں اب ماحولیاتی بحران بھی شامل ہوچکا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صنعتی انقلاب جو نوآبادیات قائم کرکے برپا کیا گیا تھا، کا ایک ''تحفہ'' ماحولیاتی بحران ہے۔ اسی نوآبادیاتی نظام نے پاکستان کی عوام کو دوسرا ''تحفہ'' اس ملک کے طبقہ اشرافیہ کی شکل میں دیا ہے۔ اس جابر طبقے کا امیر صنعتی ممالک کی اشرافیہ سے گٹھ جوڑ پاکستان کے معاشی، سیاسی، معاشرتی اور ماحولیاتی بحران کا ذمہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان کی پارلیمان بڑے بڑے سردار خاندانوں اور زمیندار طبقے کی نمائندگی سے چلائی جارہی ہے۔ اس قدر ظالم طبقہ قائم کرنے کے بعد ''صنعتی ترقی'' کا رجحان بھی امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک نے نوآبادیاتی دور سے نکلنے کے بعد ''آزاد'' پاکستان میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی نجکاری اور آزاد تجارت کی پالیسیوں کے تحت لاگو کروایا ہے۔ آئی ایم ایف کی مہربانیوں کے تحت آج پاکستان 65 بلین ڈالرز (تقریباً 7 ہزار ارب روپے) سے زیادہ کا قرض دار ہے۔[28] ان حالات میں کیا ممکن ہے کہ پاکستان کے پسے ہوئے عوام یہ امید رکھیں کہ اس کے حکمران موسمی انصاف دے پائیں گے؟ جواب مشکل نہیں۔ ترقیاتی انصاف جس کا ایک جز موسمی انصاف بھی ہے اسی وقت ممکن ہے کہ جب عوام ظلم کی ہر شکل کے خلاف کمربستہ ہوجائے۔

حوالہ جات

1۔ عذرا طلعت سعید۔ ''متبادل ایندھن: استحصال کے نئے ہتھکنڈے۔'' چیلنج، جلد 8، شمارہ 2، مئی تا اگست، 2015۔

2. European Commission. "Climate Action: Paris Agreement." European Commission, 23 December, 2015. Accessed from http://ec.europa.eu/clima/policies/international/negotiations/future/index_en.htm

3. Ibid.

4. Center for Climate and Energy Solutions. "Outcomes of the U.N. Climate Change Conference: 21st session of the Conferene of the Parties to the United Nations Framework Convetion on Climate Change (COP21), November 30 - December 12, 2015." C2ES, 2015. Accessed from http://www.c2es.org/docUploads/cop-21-paris-summary-12-2015-final.pdf

5. UNFCCC. "Historic Paris Agreement on climate change ?195 nations set path to keep temperature rise well below 2 degrees Celsius." UNFCCC, December 12, 2015, Accessed from http://newsroom.unfccc.int/unfccc-newsroom/finale-cop21/

6. European Commission. "Climate Action: Paris Agreement."

7. UNFCCC. "Adoption of the Paris Agreement." FCCC/CP/2015/L.9. Conference of the Parties, Twenty-first session, 30 November to 11 December, 2015. FCCC/CP/2015/L.9. UNFCCC.

8. Carbon Brief. "Analysis: the final Paris climate deal." Carbon Brief, 12 December, 2015. Accessed from http://www.carbonbrief.org/analysis-the-final-paris-climate-deal

9. Ibid.

10. Center for Climate and Energy Solutions. "Outcomes of the U.N. Climate Change Conference: 21st session of the Conference of the Parties to the United Nations Framework Convetion on Climate Change (COP21), November 30 - December 12, 2015." C2ES, 2015, p. 3.

11. UNFCCC. "Adoption of the Paris Agreement," p. 23.

12. Ibid.

13. Center for Climate and Energy Solutions. "Outcomes of the U.N. Climate Change Conference," p. 4.

14. UNFCCC. "Adoption of the Paris Agreement," p. 25.

15. Ibid, p. 8.

16. Ibid, p. 7.

17. Ibid, p. 25.

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 6 پر دیکھیں)

نیسلے پاکستان کا جائزہ

تحریر: محمد مجتبیٰ

تعارف

انسانی تاریخ جب اس نہج پر پہنچی کہ ایک خطے کے باشندوں کو دور دراز علاقوں کے رہائشی باشندوں سے اپنی ضروریات زندگی کے حصول کے لیے میل ملاپ اور تجارت کو فروغ دینا پڑا تو اس کام کو پیشہ ورانہ انداز میں سرانجام دینے والا طبقہ نمودار ہوا جو کہ تاریخ میں تاجر یا مرچنٹ کے نام سے رقم ہوا۔ انہی تاجروں نے بعد میں چھوٹے کارخانوں سے شروعات کی اور وقت کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر ان کمپنیوں کی اجارہ داری قائم کرکے دھیرے دھیرے دنیا کے تمام تر وسائل اور ذخائر پر قابض ہوتے چلے گئے۔

نیسلے ان ہی بین الاقوامی کمپنیوں میں سے ایک ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں نیسلے سے متعلق چند معلومات کو زیرِ بحث لانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نیسلے کیا ہے؟

تقریباً ڈیڑھ سو سالہ[1] نیسلے سوئٹزرلینڈ کے شہر ویوے (Vevey) میں صدر دفتر رکھنے والی خوراک اور مشروبات خاص کر دودھ اور اس کی مصنوعات بنانے والی بین الاقوامی کمپنی ہے جو کہ آمدنی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی خوراک کی کمپنی[2] اور عمومی عالمی درجہ بندی میں 70 ویں نمبر پر ہے۔[3] نیسلے کی دنیا کے 194 ممالک میں 447 فیکٹریاں اور تقریباً 339,000 ملازمین ہیں۔[4] 2011 میں نیسلے کے چیئرمین پیٹر برابیک نے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ ''نیسلے کی 2011 میں منڈی میں سرمایہ 200 بلین امریکی ڈالرز سے زیادہ تھا جبکہ صرف 29 مصنوعات کمپنی کو سالانہ ایک بلین امریکی ڈالرز سے زیادہ کما کر دیتی ہیں۔ نیس کیفے کی ایک مخصوص ڈولچے گسٹو (Dulche Gusto) نامی کافی نے صرف تین سال میں 2011 تک کمپنی کو 500 ملین ڈالرز سے زائد کا منافع کما کر دیا تھا''۔[5] 2004 میں اقوام متحدہ کی کانفرنس برائے تجارت و ترقی (United Nations Conference on Trade and Development) نے نیسلے کو پوری دنیا مین اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے اعتبار سے دنیا کی تیسری بڑی کمپنی کا درجہ دیا۔[6]

نیسلے پاکستان

نیسلے پاکستان، نیسلے کی ذیلی کمپنی ہے جو کہ کراچی اور لاہور کے حصص بازار (اسٹاک ایکسچینج) میں اندراج رکھتی ہے۔ 1988 میں نیسلے نے پاکستان میں ملک پیک لمیٹڈ کے ساتھ مل کر کام شروع کیا اور 1992 میں اسکے انتظامی امور مکمل طور پر حاصل کر لیے۔[7] نیسلے پاکستان کے کارپوریٹ دفاتر کراچی اور لاہور میں قائم ہیں جبکہ علاقائی دفاتر کوئٹہ، حیدرآباد، لاہور، گجرانوالہ، فیصل آباد، ملتان، جہلم، پشاور اور اسلام آباد میں ہیں۔ نیسلے پاکستان کی فیکٹریاں شیخوپورہ، کبیروالا، کراچی اور اسلام آباد میں قائم ہیں۔[8] ضلع خانیوال میں کبیر والا فیکٹری نیسلے کی دنیا کی سب سے بڑی دودھ کو خام مال کے طور پر استعمال کرنے والی فیکٹری ہے۔ نیسلے پاکستان، صوبہ پنجاب اور صوبہ سندھ میں اپنے سب سے بڑے دودھ اکٹھا کرنے کے نظام کی بدولت تقریباً ایک لاکھ نوے ہزار کسانوں سے دودھ اکٹھا کررہی ہے۔ 1988 سے 2010 تک 22 سالوں میں نیسلے پاکستان نے 50 بلین روپے سے زیادہ کی سرمایہ کاری کی جبکہ اس کی صرف 2010 کی فروخت 51 بلین روپے کی تھی۔[9]

نیسلے پاکستان کی مختصر تاریخ نکات کی صورت میں پیش کی جارہی ہے۔[10]

- 1979 ملک پیک لمیٹڈ کی بنیاد سید بابر علی نے رکھی اور ڈبا بند، ملائی، مکھن اور پھلوں کے جوس وغیرہ بنانے شروع کیے۔
- 1981 ملک پیک لمیٹڈ نے شیخوپورہ فیکٹری میں ڈبا بند (UHT) دودھ کی پیداوار شروع کی۔
- 1988 نیسلے نے ملک پیک لمیٹڈ کے 40 فیصد حصص (شیئرز) خرید لیے۔
- 1990 شیخوپورہ فیکٹری میں نیسلے کے خشک دودھ نیڈو اور دلیے (سیریلز) کی پیداوار شروع ہوئی۔ اس کے علاوہ کبیر والا میں بھی ایک نیا پلانٹ لگایا گیا۔
- 1992 نیسلے نے ملک پیک لمیٹڈ کمپنی کے انتظامی امور حاصل کیے اور دودھ اکٹھا کرنے کا لائحہ عمل کو ترتیب دیا۔ میگی نوڈلز کا پلانٹ کبیر والا فیکٹری میں لگایا گیا۔
- 1993 نیسلے، ملک پیک کو لیکر برآمدی منڈی میں داخل ہوا اور بیرون ملک متحدہ عرب امارات، برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، سری لنکا، ملائیشیا، بنگلہ دیش اور افغانستان سمیت وسطی ایشیا کے دیگر ممالک تک اپنی مصنوعات کی منڈی بڑھائی۔[11]
- 1996 ملک پیک لمیٹڈ کا نام نیسلے ملک پیک لمیٹڈ سے تبدیل ہوا۔
- 1997 کبیر والا پلانٹ مکمل طور پر نیسلے پاکستان نے حاصل کرلیا۔
- 1998 نیسلے کا پانی پیور لائف کے نام سے متعارف ہوا۔
- 1998 نیسلے ٹھیکیداروں کے بجائے کسانوں سے براہ راست دودھ اکٹھا کرنے کے قابل ہوا۔
- 2001 نیسلے پاکستان نے فانٹالیا (Fontalia) اور آوا (AVA) نامی پانی کی کمپنیاں حاصل کرلیں جو کہ گھروں اور دفاتر میں پانی پہنچانے میں ماہر سمجھی جاتی تھیں۔
- 2004 افغانستان نیسلے پاکستان کی مصنوعات کا چوتھا فروخت کا مرکز بن گیا۔

- 2005 نیسلے ملک پیک لمیٹڈ کا نام نیسلے پاکستان لمیٹڈ ہو گیا۔ ساتھ ہی دنیا بھر میں موجود نیسلے کی باقی کمپنیوں سے تعاون اور معلومات کی فراہمی کا باقاعدہ سلسلہ بھی شروع ہوا۔
- 1990 سے 1998 کے دوران نیسلے کی پیور لائف سمیت 21 مصنوعات منظر عام پر آئیں۔[12]

پاکستان میں نیسلے کی مصنوعات

یوں تو نیسلے پاکستان میں کئی مصنوعات کا کاروبار کرتی ہے۔ مگر کچھ مصنوعات پاکستانی منڈی اور صارفین میں بہت مقبول ہیں۔ جن میں سے چند اہم مصنوعات کو تحریر ھذا میں زیر بحث لایا جا رہا ہے۔

نیسلے کے ڈبا بند دودھ

پاکستان میں نیسلے کے ڈبا بند دودھ شہروں کے ساتھ ساتھ دیہاتوں میں بھی مقبول ہیں جو کہ مختلف حجم (سائز) میں فروخت کیے جاتے ہیں۔ نیسلے ملک پیک کا 250 ملی لیٹر (ایک پاؤ) کا ڈبا 30 روپے[13] اور ایک لیٹر کے ڈبے کی قیمت 110 روپے[14] جبکہ نیس ویٹا کیلشیم پلس 200 ملی لیٹر کی قیمت 30 روپے اور ایک لیٹر کی قیمت 140 روپے ہے۔

نیسلے کے خشک دودھ

مذکورہ بالا دودھ کے علاوہ نیسلے کے اور بھی کئی قسم کے دودھ منڈی میں دستیاب ہوتے ہیں جنکی علیحدہ علیحدہ توجیحات اور استعمال واضح ہیں۔ نیسلے کے خشک دودھ کی مصنوعات میں چائے کا خاص دودھ ایک کلو ایوری ڈے کی قیمت 700 روپے جبکہ بچوں کے خشک دودھ نیڈو کی ایک کلو کی قیمت لگ بھگ ایک ہزار روپے ہے۔ اسی طرح نومولود بچوں کے دودھ (بے بی ملک) کے 400 گرام ڈبے کی قیمت تقریباً 435 روپے اور دوسرے برانڈ بنام آل- 110 (All-110) کی قیمت 850 روپے ہے۔

نیسلے ملائی

نیسلے جب کسانوں سے دودھ لیتی ہے تو اس میں چکنائی کی مطلوبہ مقدار کی تصدیق کے لیے دودھ میں موجود چکنائی کی جانچ کر لیتی ہے تاکہ خود اس میں سے ملائی الگ کر کے علیحدہ ڈبوں میں ایک الگ شے کے طور پر فروخت کرے۔ نیسلے کی 200 ملی لیٹر ملائی کی قیمت 75 روپے ہے۔ جس میں 30 فیصد چکنائی ہوتی ہے۔[15]

نیسلے دہی اور رائتہ

نیسلے کے ڈبا بند دودھ، خشک دودھ اور ملائی کے علاوہ منڈی میں نیسلے کا دو طرح کا دہی اور رائتہ دستیاب ہے۔ نیسلے کے 400 گرام دہی کے ڈبے کی قیمت 95 روپے اور 105 روپے ہے۔ اس کے علاوہ نیسلے زیرہ رائتہ اور نیسلے پودینہ رائتہ کے 250 گرام کے ڈبے کی قیمت 70 روپے ہے۔

نیسلے پیور لائف

نیسلے کا پانی "پیور لائف" کے نام سے بازار میں دستیاب ہے جو کہ دنیا کے پانچ براعظموں کے 32 ممالک میں فروخت ہوتا ہے۔ پاکستان میں نیسلے پیور لائف برانڈ 1998 میں متعارف ہوا۔[16] 2003 میں متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب برآمد شروع ہوئی۔[17] 2002 میں نیسلے نے اپنے پانی کے کاروبار کو "نیسلے واٹرز" (نیسلے پانی) کا نام دیا جو کہ 2005 تک دنیا کے 130 ممالک میں 77 مختلف ناموں کے ساتھ موجود تھا جیسے کہ پاکستان میں نیسلے کا پانی پیور لائف کے نام سے جانا جاتا ہے۔ نیسلے واٹرز نیسلے کی تمام مصنوعات کی مجموعی فروخت کا دس فیصد حصہ تھا۔[18] 2014 میں بوتل بند پانی کی فروخت میں نیسلے بوتل کا حصہ 54 فیصد تھا۔[19] پاکستان میں بوتل بند پانی کی منڈی کی سالانہ بڑھوتری 40 فیصد تھی جو 2000 میں نیسلے کا پانی آنے کے بعد دنیا کی سب سے تیز ترین اضافے کے ساتھ 140 فیصد ہو گئی۔[20]

نیسلے پیور لائف کے حالیہ نرخوں کے مطابق 500 ملی لیٹر بوتل کی قیمت 25 روپے اور ڈیڑھ لیٹر بوتل کی قیمت 50 روپے ہے جبکہ پانچ لیٹر بوتل کی قیمت 140 روپے ہے۔[21]

نیسلے جوس

نیسلے نے دیگر غذائی اشیاء اور مشروبات کے علاوہ پھلوں کے رس یا جوس کے کاروبار میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ نیسلے کی کئی مشروبات منڈی میں دستیاب ہیں جن میں نیسلے فروٹا وائٹلز (Nestle Fruita Vitals) کے تحت کینو، انار (قیمت 220 روپے فی لیٹر) سیب اور چونسا آم کا رس (قیمت 150 فی لیٹر) و دیگر شامل ہیں۔ نیسلے مانگو کا 200 ملی لیٹر کا ڈبا 35 روپے اور نیس فروٹا سیب کا شربت 100 روپے فی لیٹر کے حساب سے دستیاب ہے۔ اسکے علاوہ نیسلے آم کا شربت (Nestle Mango Drink) اور نیسلے کینو آم کا شربت (Nestle Orange Mango Drink) بھی دستیاب ہیں۔[22]

میگی نوڈلز

میگی نوڈلز نیسلے کی ایک اور اہم پیداوار ہے جو 1947 سے پہلے ایلی منٹانا ایس اے (میگی) {Alimentana S. A (Maggi)} نامی کمپنی نے بنائی تھی۔ 1947 میں نیسلے نے اس کمپنی سے الحاق کیا تو میگی نوڈلز نیسلے کے نام سے فروخت ہونے لگا۔[23] میگی نوڈلز پاکستان میں پچھلے 20 سالوں سے دستیاب ہے جس میں اب کئی طرح کے ذائقے بھی آنے لگے ہیں۔ میگی نوڈلز کا ذائقہ پیکٹ میں شامل مصالحے سے بنتا ہے۔ میگی نوڈلز کی قیمت 15 سے 25 روپے کے درمیان ہے۔

دودھ کا حصول

نیسلے اپنی دودھ سے بنی مصنوعات کے لیے دودھ عام اور چھوٹے کسانوں سمیت ڈیری فارمز سے حاصل کرتا ہے۔ کسانوں اور ڈیری فارمز سے دودھ حاصل کرنے کے طریقے کار کو سمجھنے کے لیے نیسلے اور دیگر کمپنیوں کو دودھ فراہم کرنے والے چھوٹے کسانوں اور ڈیری فارم کے رکھوالوں سے رابطہ کیا گیا جس کے لیے صوبہ پنجاب کے ضلع ساہیوال، ضلع ملتان، ضلع رحیم یار خان، ضلع مظفر گڑھ اور ضلع راجن پور کے علاوہ صوبہ سندھ کے ضلع بدین کے دیہاتوں میں چھوٹے کسانوں اور دیگر ڈیری فارمز میں کام کرنے والے مزدوروں سے معلومات حاصل کی گئیں۔ ان کسانوں سے حاصل کردہ معلومات مختصراً درج ہیں:

دودھ کی پیداوار

انسان صدیوں سے گائے، بھینس، بکری اور اونٹنی کے دودھ سے استفادہ حاصل کرتا رہا ہے مگر حالیہ دور میں عموی طور پر گائے اور بھینس کے دودھ نے تجارتی حیثیت اختیار کی تو انسانی توجہ کا مرکز بھی یہی دو جانور بن گئے۔ بھینس اور گائے کے دودھ دینے کے دورانیے اور مقدار میں نسل، صحت، عمر اور خوراک کی وجہ سے فرق پڑتا ہے۔ ایک عام بھینس عموماً دو سے پانچ کلو دودھ ایک وقت میں دیتی ہے جبکہ بھوری نسل کی بھینس دگنا دودھ بھی دے سکتی ہے۔ دودھ کی پیداوار کے حوالے سے ساہیوال نسل، پنجاب نسل سے قدرے زیادہ دودھ دیتی ہے۔ بھینس کی دودھ کی پیداوار کو بڑھانے کے لیے اسے ''خوش'' رکھنا بھی ضروری ہے جس سے مراد اس کو روزانہ کی بنیاد پر نہلانا، ٹھنڈی جگہ پر رکھنا شامل ہے۔[24]

کسانوں سے کی گئی بات چیت سے سمجھ میں آیا کہ جیسے جیسے سرمایہ داری نظام کے تحت دودھ منڈی میں بکنے والی شہ بنتی گئی ویسے ویسے دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لیے غیر قدرتی طریقہ کار استعمال کیا جانے لگا۔ اس مقصد کے لیے خوراک میں چارے، کھل، توڑی، ونڈا اور شیرہ کے ساتھ یوریا بھی شامل کیے جانے لگا جس کی ترغیب یو ایس ایڈ کی مالی امداد سے چلنے والا ڈیری اینڈ ڈیولپمنٹ فاؤنڈیشن (DRDF) خود دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایات بھی ہیں کہ زیادہ نہ کھلائیں کیونکہ جانور مر بھی سکتا ہے۔[25] اس کے علاوہ دودھ کی غیر قدرتی پیداوار حاصل کرنے کے لیے شیرہ میں یوریا ملانا خود کمپنی والے بھی تجویز کرتے ہیں۔ دودھ کی پیداوار میں اضافے کے لیے غیر ملکی نسل کی گائے اور بھینسوں کی درآمد بھی جاری ہے۔ بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے والے ہولسٹائن نسل کے جانوروں کو آسٹریلیا سے درآمد کررہے ہیں اور جدید طریقوں پر دودھ کی پیداوار اور اس کا کاروبار کررہے ہیں۔ ان جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے خاطر خواہ انتظامات کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خوراک و ادویات کا بھی خاص خیال رکھنا گرمی سے بچاؤ کے لیے روم کولر اور پانی کے فواروں کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اسکے علاوہ افزائشِ نسل کے لیے اب مصنوعی طریقہ کار (artificial insemination) بھی استعمال کیا جارہا ہے جس کے تحت مقامی جانوروں کی افزائش نسل غیر ملکی جانوروں کے مادہ منویہ سے کی جارہی ہے۔[26]

دیہاتوں میں کمپنیوں کے انتظامات

نیسلے کے ساتھ ساتھ دیگر کمپنیوں نے بھی دیہاتوں میں جگہ جگہ اپنے کلیکشن سینٹر (دودھ جمع کرنے کے مخصوص مقامات) بنا رکھے ہیں جہاں کسان دودھ فروخت کرتے ہیں۔ پاکستان میں ان کلیکشن سینٹرز کی تعداد 3,500 اور چلنگ سینٹرز (دودھ کو ٹھنڈا رکھنے کی مشین کے مقامات) کی تعداد 3,300 تک ہے۔[27] جن کسانوں کی دودھ کی پیداوار کم ہوتی ہے یا وہ کمپنی کے کلیکشن پوائنٹ سے دور رہتے ہیں وہ اکثر اپنا دودھ دودھیوں کو دے دیتے ہیں جو ان سے 40 سے 45 روپے فی لیٹر خرید کر کمپنی کو کم و بیش 48 روپے فی لیٹر فروخت کردیتے ہیں جبکہ ڈیری فارمز پر کمپنی کی گاڑی دودھ اکٹھا کرنے آتی ہے۔ نیسلے ڈیری فارمز کو ایک لیٹر دودھ کی قیمت 55 سے 60 روپے کے درمیان ادا کرتی ہے۔ کلیکشن سینٹر اور ڈیری فارمز سے کمپنی کی گاڑی اپریل تا ستمبر صبح 9 بجے سے اور شام 8 بجے سے جبکہ اکتوبر تا مارچ صبح 10:30 بجے سے اور شام 7:30 بجے سے دودھ اکٹھا کرتی ہے۔

دودھ کے بنیادی ٹیسٹ

کمپنیوں کے منتخب کردہ کلیکشن پوائنٹ پر موجود کمپنی کے تنخواہ دار ملازم کسانوں اور دودھیوں سے دودھ خریدتے وقت کئی بنیادی ٹیسٹ کرتے ہیں۔[28] کسان سے حاصل کردہ دودھ جب ان ٹیسٹ پر پورا نہیں اترتا تو کسان کو دودھ واپس کردیا جاتا ہے۔ کسانوں سے بات چیت کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ کچھ جگہوں پر کم معیار کا دودھ کم قیمت میں خرید لیا جاتا ہے۔

دودھ کی کھپت

گیلپ اور گیلانی کا قومی سروے 2011 کے مطابق باقی کمپنیوں کے مقابلے نیسلے کا ڈبا بند دودھ کی فروخت میں حصہ 25 فیصد ہے۔[29] اس سروے کے مطابق صرف 10 فیصد صارف خاندان یومیہ تین کلو سے زیادہ دودھ استعمال کرتے ہیں باقی 90 فیصد صارف خاندان یومیہ تین کلو سے کم دودھ استعمال کرتے ہیں۔[30]

نیسلے پاکستان کے معاہدے

اب نیسلے پاکستان کے کچھ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے معاہدوں اور مشترکہ منصوبوں کا ذکر کرتے ہیں۔

نیسلے اور پرائم منسٹرز یوتھ بزنس لون (PMYBL) کا اشتراک

23 مئی، 2015 کو پاکستان کے ایک انگریزی اخبار ''دی نیوز'' میں وزیر اعظم کی

کاروباری قرضے کی اسکیم اور نیسلے کے باہمی تعاون کے متعلق ایک خبر شائع ہوئی جس کا براہ راست تعلق یہاں کے مویشی پالنے والے کسانوں سے ہے۔ اس خبر کے مطابق نیسلے پاکستان کے مینجنگ ڈائریکٹر مگڈی بتاتو (Magdi Batato) اور نیشنل بنک آف پاکستان کے صدر سید احمد اقبال اشرف نے مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کیے جس کے تحت منصوبے کے پہلے مرحلے میں 21 سے 45 سال کی عمر کے مویشی پالنے والے کسان اپنے موجودہ کاروبار میں اضافے یا نئے کاروبار کے آغاز کے لیے نیشنل بینک کو قرضے کے لیے درخواست دے سکیں گے۔ کمپنی مستقبل میں مزید کسانوں کو بھی یہ سہولت فراہم کرنے کے لیے پرعزم ہے۔ یہ اشتراک نوجوانوں کو ذاتی روزگار کی فراہمی کے لیے قرض فراہم کرکے روزگار کے مواقع پیدا کرنے میں مددگار ہوگا جس کے نتیجے میں نوجوان نیسلے کو دودھ فروخت کرسکیں گے۔[31]

چونسا مینگو پروجیکٹ[32]

نیسلے پاکستان اور آسٹریلیا پاکستان ایگریکلچر سیکٹر لنکجز پروگرام (Australia-Pakistan Agriculture Sector Linkages Program/ASLP) کے باہمی اشتراک سے پاکستان میں چونسا آم کی پیداوار کا منصوبہ جاری ہے جس میں حکومت پاکستان کا تعاون بھی شامل ہے۔ اس منصوبے کے لیے مالی تعاون آسٹریلین سینٹر برائے بین الاقوامی زرعی تحقیق (Australian Centre for International Agricultural Research) کررہا ہے۔ اس منصوبہ کا مقصد جامعات اور تحقیقی اداروں کی جانب سے مقامی آم کے کاشتکاروں کو تربیت دینا اور آم کی پیداوار کو برآمدی حیثیت میں بڑھانا ہے۔ 2014 میں اس منصوبے کو مظفر گڑھ، رحیم یار خان، خانیوال اور ملتان میں بڑھایا گیا۔ ملتان میں یہ منصوبہ ابھی چار مختلف مقامات پر جاری ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

- ہیڈ محمد والا۔
- امتیاز حسین فارم (نواب پور)۔
- صداقت شیخانہ فارم (نواب پور)۔
- بند بوسن سڑک۔

نیسلے دودھ کی طرح چونسا آم کے منصوبے کے تحت بھی کسانوں سے اپنی مصنوعات کے لیے آم کی پیداوار حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مذکورہ بالا فارمز سے حاصل ہونے والی معلومات میں سے دو اہم باتیں سامنے آئیں اور وہ یہ کہ اس منصوبہ کے تحت نیسلے کسانوں کو چونسا آم کی پیداوار بہتر بنانے کے لیے کھاد اور کیڑے مار ادویات فراہم کررہا ہے۔ دوسرا یہ کہ بین الاقوامی منڈی کا مقابلہ کرنے کے لیے چونسا آم کی پیداوار میں اضافہ کیا جارہا ہے۔

پی سی ایس آئی آر اور نیسلے

پاکستان میں سائنسی اور صنعتی حوالے سے سرکاری تحقیقی ادارہ، پاکستان کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (پی سی ایس آئی آر) کا ایک اہم کام ملک میں خوراک اور مصنوعات کے معیار کی نگرانی اور اس کا تنقیدی جائزہ لینا اور معیار کو بہتر بنانے کے لیے اقدامات کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ درآمد/برآمد کرنے والے تاجروں کے لیے بہتر معیار کے تعین کو یقینی بنانا ہے۔[33] 22 اپریل، 2015 کو لاہور میں نیسلے اور پی سی ایس آئی آر نے تحفظ خوراک کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے صحت کے عالمی دن کے موقع پر مشترکہ تعاون سے سیمینار منعقد کرایا۔[34] جس میں پی سی ایس آئی آر لاہور کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر شہزاد عالم نے نیسلے کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ”میں نیسلے پاکستان کی تحفظ خوراک کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے سیمینار منعقد کرانے کی کاوشوں کو سراہتا ہوں۔ یہ ہمیں دیگر متعلقہ فریقین کے ساتھ بیٹھ کر اس مسئلے سے نمٹنے کے قابل بنائیگا۔“

نیسلے پاکستان کی مالیاتی رپورٹ

	ستمبر 2014	ستمبر 2015	شرح اضافہ
مجموعی فروخت	74,302 ملین روپے	77,197 ملین روپے	3.9 فیصد
خالص منافع	6,405 ملین روپے	7,682 ملین روپے	19.9 فیصد

اس طرح نیسلے کی فی شیئر آمدنی میں پچھلے سال کے نسبت تقریباً 20 فیصد اضافہ ہوا۔[35] دسمبر 2015 رپورٹ کے مطابق نیسلے پاکستان کے 59 فیصد شیئر اسی کے پاس ہیں۔ نیسلے نے پاکستان میں 2012 سے اب تک 180 ملین ڈالرز کی سرمایہ کاری کی ہے۔ یہ سرمایہ کاری کمپنی نے اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافے اور ترسیل کو بہتر بنانے کے لیے کیں جس کے نتیجے میں کمپنی کی فروخت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس کے منافع میں بھی بھاری اضافہ ہوا۔ کمپنی کے فراہم کردہ اعداد وشمار کے تحت کمپنی کے منافع میں مسلسل خاطر خواہ اضافہ ہورہا ہے۔ مثال کے طور پر 2007 سے 2012 کا خالص منافع 5.8 بلین روپے کا تھا جبکہ 2013-14 کا منافع 36 فیصد بڑھ کر 7.9 بلین روپے ہوگیا۔[36]

مشترکہ مفادات کا قیام (Creating Shared Value/CSV)

نیسلے مشترکہ مفادات کے قیام کا ایک تصور پیش کرتی ہے۔ نیسلے کہتی ہے کہ ”ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہم اپنے شیئر ہولڈرز کے لیے قدر پیدا کرسکتے ہیں ایسے کاروبار کے طریقے اپنا کر جو غذائیت، پانی اور دیہی طریقہ کے حوالے سے عالمی اور مقامی مسائل کا احاطہ کرے۔ مشترکہ مفادات کے قیام (CSV) سے ہماری یہی مراد ہے“۔[37] نیسلے مشترکہ مفادات کے قیام میں اپنی ترجیحات کو اس تکون کی صورت میں واضح کرتا ہے۔[38]

نیسلے پاکستان کے منتخب کردہ مشترکہ مفادات کے قیام کے اہم نکات یہ ہیں۔[39]

- غذائیت۔

- پانی۔
- دیہی ترقی۔
- ماحولیاتی تحفظ۔
- ہمارے لوگ۔

تجزیہ

مشترکہ مفادات کے قیام کی تعریف نیسلے کی حقیقی پالیسیوں اور موصول ہونے والی خبروں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتیں۔ غذائیت، پانی، دیہی ترقی اور ماحولیاتی پائیداری سمیت قانون، کاروباری اصول اور ضابطہ اخلاق کی تعمیل جیسے نعروں اور ارادوں کی تکمیل کے لیے ان کے دیگر کاروباروں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتے۔ اس حوالے سے نیسلے اپنی سماجی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مشترکہ مفادات کے قیام کے جو نکات پیش کرتا ہے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔

غذائیت

ذیل میں نیسلے کے غذائیت پوری کرنے کے دعوے کے حوالے سے چند مثالیں شامل کی جارہی ہیں جو نیسلے کے دعوؤں کے برعکس ہیں اور کچھ اور ہی حقیقت بتاتی ہیں۔

ڈبا بند دودھ

ڈبا بند دودھ یا ٹیٹرا پیک دودھ کی مجموعی حیثیت پر بات کرنا اشد ضروری ہے۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ٹیٹرا پیک کی منڈی کو بہت تیزی سے فروغ دیا جارہا ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ صارفین کو کھلے دودھ کے بجائے ڈبا بند دودھ کی طرف راغب کیا جائے مثلاً پاکستان کے کئی ٹیلی ویژن چینلز پر ایک عرصے تک بنا کسی کمپنی یا برانڈ کے نام کے صرف ٹیٹرا پیک دودھ کو فروغ دینے کے لیے اشتہار چلتے رہے ہیں۔ مذکورہ اشتہاروں میں صرف ڈبا بند دودھ کی خاصیت ہی بیان نہیں کی جاتی تھی بلکہ کھلے دودھ کے نقصانات بھی بیان کیے جاتے تھے اور محنت کش گوالوں کی کردار کشی بھی کی جاتی تھی جس کا مقصد عوام کو سستے اور تازہ دودھ کی جگہ کمپنیوں کا تیار کردہ مہنگا دودھ استعمال کرنے کی ترغیب دینا تھا۔

یہ خیال رہے کہ نیسلے نے سید بابر علی سے ملک پیک لمیٹڈ خریدی تھی جو خاندان کے دیگر افراد سمیت نیسلے کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیٹرا پیکجز کے بھی مالک ہیں۔ ٹیٹرا پیک دودھ کے حوالے سے کئی تحقیقات سامنے آچکی ہیں جس سے اس کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ ان ہی میں کچھ کا ذکر مختصراً درج ہے۔

تحقیقات کے مطابق ٹیٹرا پیک دودھ کو محفوظ کرنے کے لیے اس میں ایک مادہ فارمل ان (فارمل ڈیہائڈ)40 شامل کیا جاتا ہے۔41 نیسلے بھی اپنے دودھ میں فارمل ان شامل کرتا ہے جو کہ مردوں (لاشوں) کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس مادے سے انسانی صحت پر اس کے انتہائی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ خوراک میں شامل یہ مادہ جسم میں تیزابیت بڑھانے کے ساتھ ساتھ طویل سکتہ (کوما) اور موت کا سبب بھی ہوسکتا ہے۔42 یہ وہ کیمیائی مادہ ہے جو ہوا کے دس لاکھ حصوں میں اگر 0.1 حصے تک بڑھ جائے تو کچھ لوگوں کی ناک، گلے اور آنکھوں میں جلن کے ساتھ پانی آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانسی، سانس لینے میں دشواری (گھٹن)، متلی اور خارش کی شکایات بھی ہوسکتی ہیں۔ 1980 میں ہونے والی تحقیق کے مطابق اس کیمیائی مادہ کی حامل کسی بھی اشیاء کا مسلسل استعمال خطرناک اور مختلف بیماریوں کے علاوہ کینسر کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔43 اس کے بعد بھی کچھ تحقیقات سامنے آئیں جن کے تحت یہ مادہ کینسر کی کئی اقسام سے جڑا ہوا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی کینسر پر تحقیق کرنے والی بین الاقوامی ایجنسی (International Agency for Research on Cancer/IARC) نے اس مادے کو انسانوں کے لیے کینسر پیدا کرنے والا مادہ قرار دیا۔44 اس کے علاوہ 2011 میں امریکہ کے نیشنل ٹاکسی کالوجی پروگرام (National Toxicology Program) 45 اور نیشنل اکیڈمی برائے سائنس، انجینئرنگ اور میڈیسن نے اپنے جاری کردہ اعلامیہ میں اس مادہ کو یقینی طور سے کینسر کا باعث قرار دیا ہے۔46

نیسلے دودھ کے ساتھ اپنی دیگر مصنوعات میں بھی اس مادے کا استعمال کرتا ہے۔47 بعض کمپنیاں اس کیمیائی مادے کا نام اپنی مصنوعات کے اجزاء کی فہرست میں شامل کرنے سے کتراتی ہیں اس لیے صارفین کو دھوکہ دینے کی غرض سے فارمل ڈیہائڈ کے مختلف متبادل نام لکھ دیتی ہیں۔48 امریکی محکمہ صحت اور انسانی خدمات (US Department of Health & Human Services) نے چند ایسی مصنوعات اور کمپنیوں کی فہرست جاری کی ہے جس میں فارمل ڈیہائڈ موجود ہوتا ہے۔49 اس فہرست میں نیسلے بھی شامل ہے۔50 دودھ کے معیار پر ہونے والی ایک اور تحقیق کے مطابق نیسلے کے ڈبے بند (ٹیٹرا پیک) دودھ میں مضر صحت اور باعث کینسر مادہ فارمل ڈیہائڈ شامل کیا جاتا ہے۔ نیٹ ورک برائے تحفظ صارف (نیٹ ورک فار کنزیومر پروٹیکشن) کی صارف رپورٹ نمبر 017/06 کے مطابق نیسلے کی مصنوعات نیسلے ملک پیک اور نیس ویٹا میں واضح طور پر فارمل ڈیہائڈ پایا گیا ہے۔51

نیسلے اور جینیاتی خوراک

نیسلے کے چیف ایگزیکٹو آفیسر (CEO) نے حال ہی میں نشر ہونے والے ایک انٹرویو میں کہا کہ ''قدرت نے ہمیں سب چیزیں بہترین حالت میں نہیں دی ہیں۔ قدرتی غذا (organic food) بہترین غذا نہیں ہے۔ امریکہ میں پچھلے 15 سالوں سے جینیاتی طور پر تبدیل غذا (genetically modified food) کے استعمال سے کوئی ایک بھی بیماری سامنے نہیں آئی ہے''52 جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ امریکہ میں ہونے والے

احتجاج اور جینیاتی تبدیلی پر مبنی غذا کا بائیکاٹ ایک طویل تاریخ رکھتی ہے اور جینیاتی تبدیلی پر مبنی غذا کے خلاف مظاہرے اور ریلیوں کی خبروں سے اخبار بھرے ہیں۔[53] امریکہ سمیت دنیا بھر میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ جینیاتی غذا پر اس کا لیبل لگا ہونا چاہیے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ وہ کیا کھاتے ہیں۔[54] اس مطالبے کا مقصد اس غذا سے کنارا کشی کرنا ہے۔ 60 سے زیادہ ممالک میں اس مطالبے کو قانونی حیثیت بھی دی جاچکی ہے۔[55] مزید شواہد کے مطابق بھی نیسلے اس جینیاتی تبدیلی پر مبنی غذا کا پرچار کرتا رہا ہے[56] اور اپنی مصنوعات میں اس کا استعمال بھی کرتا ہے۔ جس پر تھائی لینڈ میں نیسلے کی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی دھمکی بھی دی جاچکی ہے۔[57]

جینیاتی فصلوں اور غذا کے بارے میں سائنس دان کئی تحقیق سامنے لا چکے ہیں جس سے ثابت ہوا ہے کہ اس سے انسانی اور حیوانی صحت پر بہت برے اور مضر اثرات مرتب ہورہے ہیں۔ نیسلے کے سی ای او کے بیان کو اگر تاریخی اور ارتقائی پس منظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ امریکہ کی 15 سالہ تاریخ کوئی معنی نہیں رکھتی کیونکہ زمین پر جینیاتی تخلیق لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں سالوں پر محیط ہے۔ قدرت کے لاتعداد تجربوں اور ان گنت مراحل کے بعد آج زمین کی یہ شکل ابھر کر سامنے آئی ہے کہ اب اس میں کسی بھی قسم کی تبدیلی فوری طور پر اپنا نتیجہ ظاہر نہیں کرتی۔ صنعتی پیداوار شروع ہونے کے دوسو سال بعد آج دنیا کو ماحولیاتی تبدیلی کا پتا چلا ہے۔ صنعتی گیسوں کے علاوہ وہ ادویات جو فصلوں پر چھڑکی جاتی ہیں ان کا اثر بھی اب کئی سال بعد ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ایک اور تلخ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں اب سائنسی تحقیق کرنے والے ادارے انہی کمپنیوں کی دی ہوئی امداد سے چل رہے ہیں جو اپنے خلاف کوئی تحقیق منظر عام پر نہیں آنے دیتیں اور اگر آ بھی جائے تو دنیا بھر سے تحقیق کرنے والے سائنسدان کی کردارکشی کرکے اس کی تحقیق مسترد کردی جاتی ہے۔[58]

میگی نوڈلز

میگی نوڈلز پاکستان اور بھارت سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں فروخت کیا جاتا ہے۔ بھارت میں میگی نوڈلز کے حوالے سے پچھلے دنوں گشت کی جانے والی ایک خبر قارئین کی نظر ہے۔ ''بھارتی ریاست اتر پردیش میں نیسلے انڈیا کے تیار کردہ میگی نوڈلز میں خطرناک حد تک سیسے کی مقدار پائے جانے پر فوجداری مقدمہ دائر کیا گیا۔ فوڈ سیفٹی اینڈ ڈرگ ایڈمنسٹریشن (FDA) کے مطابق مارچ کے مہینے میں معمول کے تجزیے کے دوران دو درجن نوڈلز کے پیکٹ بمعہ ذائقہ بڑھانے والے لوازمات میں سیسے کی بہت زیادہ مقدار پائی گئی۔ FDA نے کمپنی کو ریاست بھر میں متعلقہ کھیپ دکانوں سے واپس منگوانے کا حکم دیا۔ مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں نیسلے انڈیا اور فروخت کنندگان کے خلاف مضر صحت مصنوعات بنانے اور فروخت کرنے پر مقدمہ دائر کیا گیا تھا''۔[59] بھارت کی اس خبر کے بعد پاکستان میں بھی میگی نوڈلز کی مصنوعات مشکوک تو ضرور ہوئی مگر کسی قسم کی کوئی تحقیق اس حوالے سے ابھی تک منظر عام پر نہیں آئی۔ پڑوسی ملک میں میگی نوڈلز پر ہونے والی تحقیق کے نتائج کے بعد پاکستان میں بھی کم از کم نیسلے کے میگی نوڈلز پر تو لازمی تحقیق ہونی چاہیے تھی؟

پانی

پانی ایک انتہائی اہم ضروریات زندگی ہے جس کے بنا زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ ہر قسم کی آلودگی اور جراثیم سے پاک پانی کی فراہمی ریاست کی اولین ذمہ داری ہے۔ ریاست اپنی اس ذمہ داری کی تکمیل میں مکمل طور پر ناکام ہوتی نظر آرہی ہے اس ناکامی کے نتیجے میں پانی اب بازار میں منافع کے لیے بکتا نظر آرہا ہے مگر اس کا بازار میں بکنا مہذب تاریخ انسانیت میں کبھی سوچا نہیں گیا تھا۔

عام خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستان میں پانی کی قلت ہے لیکن پانی کی فراہمی کو بہتر بنانے کی ترکیبیں آزمائی جائے تو صاف پانی کی ترسیل ناممکنات میں سے نہیں۔ ایک خبر کے مطابق[60] پاکستان میں ہزاروں لوگ آلودہ پانی پینے کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہیں رہتے جس سے ان کی آمدنی پر بھی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں خاص کر وہ افراد جو دیہاڑی پر کام کرتے ہیں۔ دیگر ذرائع کے مطابق پاکستان میں پینے کے پانی میں چار بڑے آلودہ کرنے والے عناصر شامل ہیں۔ ان میں سے 68 فیصد جراثیم پر مبنی ہیں۔ 24 فیصد سنکھیا، 13 فیصد نائیٹریٹ اور پانچ فیصد فلورائیڈ بھی شامل ہوتا ہے جن سے کئی قسم کی بیماریاں یقینی ہیں۔[61] اسی خبر میں شامل پاکستان واٹر کونسل کی 2006 کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں تقریباً 87 فیصد پانی انسانی استعمال کے لیے موزوں نہیں ہے۔[62]

پاکستان میں پانی کا مسئلہ قدرتی ہونے سے زیادہ سماجی اور انتظامی ہے۔ بجائے اسکے کہ اس مسئلے کا کوئی منطقی حل نکالا جاتا، سرمایہ داری کو فروغ دیتے ہوئے سماج میں تیزی سے پانی کی بوتلیں بیچی جارہی ہیں جو کہ 500 ملی لیٹر سے لیکر 19 لیٹر تک کے سائز میں موجود ہیں۔ منڈی میں موجود پانی پلاسٹک کی بوتلوں میں بند ہو کر بازاروں میں فروخت کے لیے دستیاب ہوتا ہے۔ وزارت سائنس وٹیکنالوجی پاکستان کے ماتحت کام کرنے والا ادارہ پاکستان کونسل برائے تحقیق ذخائر آب کی جولائی تا ستمبر 2015 تحقیقی رپورٹ کے مطابق 23 کمپنیوں کا پانی انسانی صحت کے لیے انتہائی مضر ہے۔[63] صاف پانی کی عدم فراہمی کا پانی فروخت کرنے والی کمپنیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور غیر معیاری پانی کی بوتلوں کی فروخت میں اضافے کی وجہ بنی۔

نئی ہونی والی تحقیقات کے مطابق نلکے کا پانی پلاسٹک کی بوتلوں والے سے زیادہ بہتر ہے (پاکستان میں صرف گھریلو اور دیسی ٹوٹکو سے پانی کو صاف کرنے کی ضرورت ہے)۔ واضح رہنا چاہیے کہ صرف ایک لیٹر پانی کی بوتل کے لیے پانچ لیٹر پانی خرچ ہوتا ہے جبکہ ایک اندازے کے مطابق ایک پانی کی بوتل خریدنے پر بمقابلہ نل کے پانی کے ایک صارف دس ہزار گنا سے زیادہ قیمت ادا کرتا ہے[64] وہ بھی ہمارے لیے فائدہ مند نہیں ہوتا۔[65] پاکستان میں بوتل کے پانی کا استعمال سالانہ 12

فیصد کی شرح سے بڑھ رہا ہے جس نے پاکستان کو بوتل کے پانی کے حوالے سے ایک انتہائی منافع بخش منڈی کے روپ میں عیاں کیا ہے۔[66]

غذائیت کی بات کرنے والی نیسلے کے کرتا دھرتا خود کیا سوچ رکھتے ہیں اس کا اندازہ ایک بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔ ایک انٹرویو میں نیسلے کے چیف ایگزیکٹو آفیسر فرماتے ہیں کہ ''پانی کو نجی ملکیت میں ہونا چاہیے اور عام انسانوں کا پانی پر کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔ پانی کی قیمت ہونے سے اس کے قیمتی ہونے کا احساس ہوگا''۔[67]

ماحولیاتی پائیداری/تحفظ

ماحولیاتی پائیداری کی بات کرنا اور حقیقی معنوں میں اس کی پاسداری کرنا دو الگ باتیں ہیں۔ ماحول کو محفوظ بنانے کے لیے منافع کو غیر محفوظ کرنا پڑتا ہے جس کی امید ان کمپنیوں سے تو بہرحال نہیں ہے۔ نیسلے ماحولیاتی پائیداری کی جو بھی تعریف کرتا ہو مگر زمینی حقائق کچھ اور ہی کہانی بیان کرتے ہیں جس کی چند مثالیں مختصراً پیش کی جارہی ہیں۔

پلاسٹک کی بوتلیں

پانی فروخت کرنے کے لیے استعمال کی جانے والی پلاسٹک کی بوتلیں (جس مین نیسلے کا بھی پانی بکتا ہے) بنانے کا مرحلہ زمین سے تیل کے اخراج سے شروع ہوتا ہے جس کے لیے (یقیناً) ایندھن درکار ہوتا ہے۔ زمین سے نکالے گئے خام تیل کو ٹرالر کے ذریعے سب سے پہلے ریفائنری (refinery) میں لاکر صاف کیا جاتا ہے (جس میں پھر ایندھن کا استعمال ہوتا ہے)۔ وہاں سے دوبارہ ٹرالرز میں لاد کر (پھر ایندھن کا استعمال) پلاسٹک فیکٹری میں لایا جاتا ہے جہاں اس تیل کو پہلے پلاسٹک دانوں اور پھر بوتلوں میں تبدیل کیا جاتا ہے (جس میں بجلی کے استعمال کے ساتھ ساتھ دیگر قدرتی وسائل کا بے تحاشہ استعمال ہوتا ہے)۔ ان بوتلوں کو تیسری بار ٹرالر میں لاد کر پانی کے پلانٹ میں لایا جاتا ہے (پھر سے ایندھن کا استعمال) جہاں ان بوتلوں میں پانی بھرا جاتا ہے(یہاں پر بھی قدرتی وسائل کا استعمال بے دریغ کیا جاتا ہے)۔ بوتلوں میں پانی بھرجانے کے بعد ان بوتلوں کو پھر سے ٹرالرز میں لاد کر گوداموں میں (ایندھن کا استعمال)، وہاں سے سپر اسٹور یا تقسیم کار (ڈسٹری بیوٹر) کے پاس (ایندھن کا استعمال) سے ہوتا ہوا تھوک فروش کے پاس (ایندھن کا استعمال)، پھر وہاں سے خوردہ فروش (ایندھن کا استعمال) اور پھر آخر میں صارفین کے پاس پہنچتا ہے۔[68]

پانی کی پلاسٹک کی بوتلیں ایک خاص کیمیائی مواد سے بنائی جاتی ہیں۔ نیسلے کا کہنا ہے کہ وہ اپنی پانی کی پلاسٹک کی بوتلیں ایسے مواد سے بناتے ہیں جو صنعتی پیداوار کے لیے دوبارہ استعمال کی جاسکیں۔ نیسلے کی بوتلیں تین طرح کے پلاسٹک سے بنائی جاتی ہیں جن میں پولی ایتھائیلین ٹیرا تھیلیٹ (polyethylene terephtalate/PET)، ہائی ڈینسٹی پولی ایتھا ئیلین (high-density polythylene/HDPE) اور پولی کاربونیٹ (poly carbonate/PC) شامل ہیں۔[69]

پولی کاربونیٹ پلاسٹک پر بہت تنقید پائی جاتی ہے کیونکہ ان میں ایک خاص قسم کی کیمیائی شہ پائی جاتی ہے جسے بیس فینول (bisphenal/BPA) کہا جاتا ہے۔ اس کیمیائی مادے کا حمل، نومولود اور بچوں کے دماغ، پراسٹیٹ کے غدود اور رویوں پر منفی اثر ہوتا ہے۔[70] نیسلے کے کاغذی دعوے اپنی جگہ پر اس کی بوتل پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ کس قسم کے پلاسٹک سے بنائی گئی ہے جبکہ یہ بوتلیں گھریلو استعمال کے لیے موزوں نہیں ہوتی انہیں دوبارہ سے صنعتی پیداوار کے لیے کچرے کی نظر کیا جانا چاہیے۔
بے شک یہ پیغام نیسلے کی بوتل پر اپنے خاص نشان کی مدد سے آویزا ہوتا ہے مگر کیا یہ پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں اس پر عملدرآمد ممکن ہے؟ ہمارے گھروں میں ان بوتلوں کے بار بار استعمال ہونے کی دو وجوہات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عام لوگوں کو نہ تو یہ سمجھ ہے کہ پلاسٹک کی بوتلوں کو دوبارہ استعمال نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی وہ بوتل پر بنے نشانات سے واقف ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے پاکستان کے تقریباً ہر گھر اور عام ہوٹلوں میں پینے کا پانی جمع کرنے کے لیے یہی بوتلیں استعمال کی جاتی ہیں۔ دوسرا یہ کہ پینے کا پانی جمع رکھنے کے لیے مناسب اور قابل استعمال بوتلیں ہر شہری کی قوت خرید میں نہیں ہے اس لیے وہ وہی پرانی بوتلیں بار بار استعمال کرتے ہیں۔

یہ وہ حقائق ہیں جو ہمارے سماج میں عام طور پر رونما ہونے والی روز مرہ کی زندگی سے اقتباس ہیں۔ پانی کی یہ پلاسٹک بوتلیں ایک طرف تو ماحولیاتی آلودگی کا باعث ہیں تو دوسری طرف صحت کے لیے بھی موزوں نہیں ہیں۔

زمینی آلودگی

تیل کے اخراج سے لیکر صارف کے استعمال تک ایندھن، مشینری، اور دیگر قدرتی وسائل کا بے دریغ استعمال اور اس کے حصول کے لیے ہونے والے استحصال کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ صارفین اس بوتل بند پانی کو استعمال کرکے بوتل پھینک دیتے ہیں جن میں سے 80 فیصد بوتلیں زمینی آلودگی بڑھانے کا سبب بنتی ہیں باقی بیس فیصد ہی بوتلیں دوبارہ کارآمد ہو پاتی ہیں جن سے بعد میں قالین اور دیگر اشیاء بنائی جاتی ہیں، لیکن آخر وہ بھی آلودگی کا ہی سبب بنتی ہیں کیونکہ پلاسٹک واپس زمین کا حصہ نہیں بنتا۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ ان سارے مراحل پر اربوں روپوں کا ایندھن جلادیا جاتا ہے جو کہ خود ماحولیاتی آلودگی کا پیش خیمہ ہے[71] ساتھ ہی دودھ اور دیگر اشیاء کے ڈبے بنانے کے لیے گتے کی ضرورت ہوتی ہے جو درختوں کی کٹائی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔

ہوائی آلودگی

مندرجہ بالا تمام تر کام فیکٹریوں اور کارخانوں میں سرانجام دیئے جاتے ہیں جہاں مزدور کے استحصال کے ساتھ ساتھ ماحول کا بھی استحصال کیا جاتا ہے کیونکہ ماحول کو بچانے کی ترکیبیں اپنی اصل شکل میں اپنانے پر کمپنیاں اپنے منافع میں کٹوتی نہیں کرنا

چاہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر ہوا میں کاربن گیس کی مقدار بڑھ رہی ہے جس کی وجہ سے عالمی حدت میں اضافے کے ساتھ بڑے پیمانے پر ماحولیاتی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔ خشک سالی، سیلاب، بے موسم اور بے تحاشہ بارشیں اور طوفان اسی کا پیش خیمہ ہیں۔

دیہی ترقی

پاکستان ایک زرعی ملک ہے جس کی زیادہ تر آبادی دیہی علاقوں میں آباد ہے، جہاں پر لوگوں کا روزگار کھیتی باڑی کرنے کے ساتھ ساتھ مال مویشی بھی پالنا ہے جس نے اس ملک کو دودھ پیدا کرنے والا تیسرا بڑا ملک بنا رکھا ہے72 لیکن افسوس یہ کہ کسانوں کی اس بڑی آبادی میں جہاں کبھی دودھ بیچنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور مہمانوں کی خاطر تواضع دودھ اور لسی سے کی جاتی تھی، جہاں طعام میں مکھن، دہی اور پنیر معمول ہوا کرتا تھا، اب یہ روایات تقریباً خاتمے کے ہی دہانے پر ہیں۔ افسوس صد افسوس یہ کہ رونا دودھ کا کیا اب تو کسانوں کے پاس جانور بھی نہیں بچ رہے۔ کسان اپنے شیر خوار بچوں کے لیے بازار سے دودھ خریدنے پر مجبور ہیں۔ جن کے پاس کچھ جانور ہیں بھی تو یا تو انکی پیداوار اتنی کم ہے کہ ان کے اپنے گھر کی ضرورت ہی پوری نہیں ہوتی یا پھر وہ دودھ جس کی مقدار ایک سے تین کلو ہوتی ہے، اپنی مالی حالت کے پیش نظر کمپنیوں کو چند روپوں کے عوض بیچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ ساہیوال میں ایک کسان سے جب اس حوالے سے یہ سوال کیا کہ اگر کوئی مہمان وغیرہ آجائے تو اس کی خاطر تواضع میں پیش کی جانے والی چائے کے لیے دودھ کا بندوبست کیسے کرتے ہیں؟ کسان نے جواب دیا کہ ''بازار سے جاکر خریدنا پڑتا ہے'' جو مہنگا بھی پڑتا ہے اور خالص بھی نہیں ہوتا۔ ان کمپنیوں کی یہ تباہ کاریاں صرف پنجاب میں نہیں بلکہ پورے ملک سمیت دنیا بھر میں کم وبیش یہی صورتحال پیدا کی جارہی ہے۔

یوں تو نیسلے کے پاکستان سمیت دنیا بھر میں بہت سے منصوبے چل رہے ہیں جنھیں وہ سماج کی بہتری کے زمرے میں ڈال کر صنعتی سماجی ذمہ داریاں نبھانے کا تاج سجالیتی ہے مگر کیا یہ منصوبے حقیقی معنوں میں سماج کی بہتری کے لیے ہی ہوتے ہیں یا پھر ان میں بھی کمپنی کی اپنی ہی تشہیر چھپی ہوئی ہے؟ نیسلے کا ایک منصوبہ WET (ویٹ) کے نام سے چل رہا ہے جس میں وہ استادوں کو پانی کے استعمال کے حوالے سے تربیت دے رہے ہیں73 لیکن سوال یہ ہے کہ نیسلے خود کتنا یومیہ پانی استعمال کرتا ہے اور کس مد میں کرتا ہے اس کا کوئی حساب کتاب منظر عام پر نہیں ہے۔ یہ بات تو پہلے ہی ہوچکی ہے کہ ایک بوتل پانی پر پانچ بوتلیں پانی کی ضائع ہوتی ہیں۔ اسی طرح نیسلے کے چونسا آم منصوبے کی وجہ سے ہمارے مقامی کسان اور آم کی صنعت کو نقصان کے ساتھ ملک میں اس کی فراہمی بھی متاثر ہوگی۔ ملتان کے مقامی کسانوں اور رہائشیوں کے مطابق اس منصوبے کی وجہ سے مقامی منڈی میں چونسا آم کی قیمت میں اضافہ ہوا ہے۔

اب اگر بات وزیر اعظم کے کاروباری قرضہ والے منصوبے کی جائے تو اس کے سوا کیا کہا جائے کہ روزگار فراہم کرنا اور روزگار کے مواقع پیدا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ چہ جائے کہ جوانوں کو مقروض کردیا جائے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ منصوبے یہاں کے کسانوں کے مفاد کے لیے ہیں یا نیسلے کے لیے؟ جو ان کے ذریعے اپنے کاروبار میں بیش بہا اضافہ کررہا ہے۔

دیگر المختصر اول یہ کہ پی سی ایس آئی آر اور نیسلے کا تعاون ایک نوید کی حیثیت تو قطعاً نہیں رکھتا۔ ریاست کو اپنی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے کسی کمپنی کے سہارے کی کیونکر ضرورت پڑ رہی ہے؟ ریاست کو اپنے امور خود انجام دینے چاہیے تاکہ اس میں سے منافع کی ہیک نہ آئے۔ اس حوالے سے ایک اور عمومی رائے پائی جاتی ہے کہ اگر ایسا کرنا بہت ضروری ہے بھی تو سرکار یا سرکاری اداروں اور کمپنیوں خاص طور پر بین الاقوامی کمپنیوں کے مابین ہونے والے تمام تر معاہدوں کی تفصیل منظر عام پر آنی چاہیے تاکہ عوام الناس کو ریاست کی ڈگر کا علم ہوتا رہے۔ دوئم اس ادارے کا دیگر کمپنیوں سمیت نیسلے کے ساتھ تعاونی گٹھ جوڑ74 اس ادارے کی کارکردگی پر سوال اٹھاتا ہے کہ کس طرح یہ ادارہ ان کمپنیوں کی مصنوعات پر تنقیدی تحقیق کا متحمل ہوسکے گا؟

دیہاتوں کے حالیہ چیدہ مسائل

نیسلے اور اس جیسی دیگر کمپنیوں کی وجہ سے دیہاتوں میں کئی مسائل جنم لے رہے ہیں گو کہ ان مسائل کا نیسلے یا دیگر دودھ کی کمپنیوں سے براہ راست کوئی تعلق نظر نہیں آتا مگر ان کمپنیوں نے جب دودھ کے شعبے میں ہاتھ ڈالا تو دیہاتوں میں پیداواری لحاظ سے بڑی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ ان ہی میں سے کچھ تبدیلیاں اور ان سے جڑے مسائل درج ذیل ہیں:

- غیر ملکی نسل کے جانوروں کا متعارف ہونا اور تیزی سے ان کی درآمد میں اضافہ ہونا۔
  - غیر ملکی نسل کا مقامی ماحول اور موسم سے مطابقت نہ ہونے سے دیگر مسائل اور بیماریوں کا خدشہ۔
  - غیر ملکی نسل کے جانوروں کی خوراک و دیگر لوازمات کا مقامی جانوروں سے زیادہ ہونے کی بناء پر اخراجات کا بڑھ جانا
  - غیر ملکی نسل کے جانوروں کی دیکھ بھال کے لیے خاطر خواہ انتظامات کرنا۔
  - غیر ملکی نسل کی وجہ سے مقامی جانوروں کی قدر میں کمی واقع ہونا۔
- دودھ کی پیداوار بڑھانے کے لیے ٹیکے کا استعمال۔
  - ڈیری فارمز کی وجہ سے چھوٹے کسانوں کو مسائل درپیش ہونا۔
- افزائش نسل کے ٹیکوں کی درآمد اور ان کے استعمال میں اضافہ ہونا۔
  - غیر ملکی نسل کی درآمد اور افزائش نسل کے ٹیکوں کی وجہ سے مقامی نسل کی ناپیدگی کا خطرہ لاحق ہونا۔

● کئی وجوہات کی بناء پہ چارے کی دستیابی کا مسئلہ۔

ہمارے لوگ

نیسلے یا اس جیسی دیگر بین الاقوامی کمپنیوں کا سب سے بڑا ہتھیار ذرائع ابلاغ ہوتا ہے۔ جس پر چلنے والے اشتہاروں کے ذریعے یہ عوام الناس کے اذہان پر اس طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں کہ عام کسان، مزدور اور محنت کش اپنی بھلی روایات کو بھول کر یا ان کو دقیانوسی جان کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ ترقی کے نام پر سہولیات اور آسائشوں کا جھانسا دینے والی یہ مصنوعات سرمایہ داری کے چکر میں ایسا گھومتی ہیں کہ ان کا محور تمام سماج ہوجاتا ہے اور وہ طبقہ جو پہلے ہی کم غذا کا شکار ہے، سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ ترقی کے نام پر چند افراد نے صرف منافع ہی کمایا ہے باقی تمام دنیا تو ان کی خدمت پر معمور ہوکر تنزلی اور بدحالی کی طرف گامزن ہے۔ اب تک ہونے والی ترقی کا اگر منطقی جائزہ لیا جائے تو ترقی کا مطلب کائنات اور قدرت کو تسخیر کرنے کے مترادف ہی معلوم ہوگا اور تسخیر سے مراد جدید سرمایہ داری لغت میں قابض ہونا ہے تو کائنات اور اس کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی اس دوڑ میں کمپنیاں اور خاص طور پر بین الاقوامی کمپنیاں سرپٹ دوڑ رہی ہیں اور ننانوے فیصد انسانوں کو کچل رہی ہیں۔ اسی حوالے سے کچھ حقائق مختصراً رقم ہے۔

نیسلے کے انسانی حقوق کے معیارات

بدقسمتی سے نیسلے انسانی حقوق کے حوالے سے اپنی بوتل کے پانی کی پالیسی کے تناظر میں اپنے اہداف اور اپنی زبان کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ نیسلے پانی کے شعبے میں اور پانی کے وسائل کے استعمال میں جامع پائیدار حکمت عملی میں ناکام رہا ہے۔ تنگ نظری پر مشتمل نظریہ پائیدار انتظام کے نقطہ نظر سے پانی پر انسانی حقوق کو رد کرتا ہے۔ نیسلے کی پانی کی پالیسی اس بیان پر ختم ہوتی ہے کہ "پانی نیسلے کی اولین ترجیح ہے اور ہمیشہ رہے گی"75 نیسلے کے اس بیان سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے؟ یہ کہ نیسلے کو زمین سے پانی کے بے انتہا اخراج سے اور بوتل کے پانی کی قوت خرید نہ رکھنے والوں کی حقوق کی پامالی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔76 دودھ، دہی، ملائی اور دیگر مصنوعات کے ذریعے بھی نیسلے کی حکمت عملی سب سے چھین کر چند کی پہنچ میں دینے کے مترادف ہے۔

شعوری سیمینار

ایک خبر کے مطابق نیسلے نے ملک میں خراب پانی اور صاف پانی کے اوپر سیمینار کرانے کے لیے لاہور کی ایک ایجنسی کو معلومات عامہ کے لیے پروگرام مرتب کرنے کو کہا تھا جس پر لاہور واٹر سپلائی کمپنی کے نمائندے نے کہا کہ "نیسلے اپنے منافع کے لیے عوام کو گمراہ کررہی ہے"77 اور جب کوئی ان کے پیداواری پلانٹ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اسے اجازت نہیں ملتی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب ریس گہرگیر، فلم بوتل لائف کے ڈائریکٹر، اپنی تحقیق کے سلسلے میں پاکستان میں نیسلے کی فیکٹری کا دورہ کرنے آئے تو انہیں نیسلے کی انتظامیہ نے اپنی کمپنی کا دورہ کرنے نہیں دیا۔78 سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر نیسلے اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو پورا کررہی ہے تو کیونکر اپنی فیکٹری میں داخل نہیں ہونے دیتی؟

قدرتی ذخائر کا بے دریغ استعمال

نیسلے پوری دنیا سمیت برازیل اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ (خصوصاً کیلیفورنیا) میں اپنے بوتل کے پانی کے لیے زمین سے قدرتی پانی کا بے انتہا اخراج کررہی ہے۔ وہاں کے رہائشوں کے مطابق نیسلے کی طرف سے بہت زیادہ پانی کے اخراج کی وجہ سے وہاں کے پانی کا ذائقہ تبدیل ہونے کے ساتھ ساتھ زیرزمین پانی کے ذخائر میں کمی کا بھی خدشہ ہے۔79 اس کے علاوہ پاکستان میں بھی جہاں پانی کی شدید قلت ہے نیسلے جیسی کمپنیاں صرف اپنے منافع کے خاطر پانی کے بچے کچے ذخائر کو خشک کر رہی ہیں۔

مستقبل کا تحفظ

اس دنیا کو کم از کم ویسے ہی اپنی اولادوں کی طرف بڑھانا جیسی ہمیں ملی تھی، ہمارا فرض اور نئی نسل کا حق ہے۔ اس لیے مستقبل کو صحت مند رہنے دینے کے لیے ہمیں اپنی اولادوں، ان کے لیے غذائیں اور معاشرہ تینوں کو ہی صحت مند رکھنا ہوگا۔ یہ بنی نوع انسان کی خواہش بھی ہے اور کوشش بھی مگر دھیان رکھیے کہ کوئی اس عمل میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش کررہا ہے جیسا کہ ذیل میں دیا جارہا ہے۔

نومولود بچوں کا دودھ

نیسلے کی سب زیادہ قابل تنقید شہ اس کا نومولود بچوں کا دودھ منڈی میں متعارف کرانا تھا۔ جس پر دنیا کے کئی ممالک میں نیسلے مخالف تحاریک کا آغاز ہوا۔ پچھلے کئی سالوں سے نیسلے کو نومولود بچوں کے لیے دودھ کا متبادل منڈی میں متعارف کرانے اور اس کی اشتہاری مہم چلانے کے ذمرے میں ماہرین اور اداروں کی جانب سے شدید تنقید کا سامنا ہے۔ نیسلے کی اشتہاری مہم ماؤں کو بوتل سے نیسلے کا دودھ پیلانے پر اکساتی ہے۔ خاص کر غذائی کمی کی شکار ماؤں اور ان ماؤں کو جن کے یہاں جڑواں بچے پیدا ہوئے ہوں جبکہ کئی بین الاقوامی صحت کی تنظیموں نے اس کو رد کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح بچے اور ماں دونوں کی صحت پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔80 ابفان (IBFAN) نامی صحت کی تنظیم نے نیسلے کے اس دودھ کے حوالے سے یہ انکشاف کیا کہ نیسلے نے اپنے دودھ کی تشہیر کے لیے ہسپتالوں میں ماؤں کو دودھ کے مفت نمونے دیے تاکہ یہاں سے جانے کے بعد بھی وہ یہی دودھ استعمال کرتی رہیں۔ اس تنظیم

نے یہ بھی دعوٰی کیا کہ نیسلے نے امداد کے نام پر قیمتی تحائف کا تبادلہ اور مالی تعاون (sponsorship) کے ذریعے صحت کے افسران پر اثر انداز ہونے کی بھی کوشش کی کہ وہ نیسلے کے اس دودھ کو ماؤں تک پہنچانے میں ان کے معاون ہوں اور یہی دودھ تجویز کریں۔81 نیسلے نے کئی ممالک میں دودھ کی ان مصنوعات کی تشہیر کے لیے قابل اعتراض نعروں کا بھی استعمال کیا جس کی وجہ سے نیسلے کو ایک بار پھر مسلسل تنقید کا سامنا ہے۔82

قانون

بظاہر تو یوں لگتا ہے کہ کمپنیاں قانون کی پابندی لازمی کرتی ہیں اور کسی حد تک یہ درست بھی ہوسکتا ہے مگر صرف اس وقت تک جب تک قانون کمپنی کی اور کمپنی کے منافع کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ اب تو کمپنیوں کے ملکی قوانین اور ضوابط میں باقاعدہ اثر انداز ہونے کی بھی غیر مصدقہ خبریں موصول ہورہی ہیں۔ دور حاضر میں ایک نئی روش چل پڑی ہے کہ اکثر کمپنیاں اپنا کام ٹھیکے پر باہر دے دیتی ہیں اور سال میں ایک یا دو دفعہ اس جگہ کا دورہ کرکے تسلی کی ضمانت دے دیتی ہیں اور پھر عموماً پورا سال وہاں غیر انسانی ماحول میں ٹھیکے پر کام ہوتا ہے جس کی اجرت دیہاڑی یا فی عدد کی صورت میں دی جاتی ہے جو کہ سرکاری سطح پر مقرر کردہ کم از کم اجرت سے بھی کافی کم ہوتی ہے۔

مزدور قوانین کی خلاف ورزی

2001 میں برطانوی چینل بی بی سی کی تحقیقاتی رپورٹ کے مطابق نیسلے نے 12 سے 14 سال کے سینکڑوں بچوں کو مالی، ٹاگو (Togo) اور برکینا فاسو (Burkina Faso) سے خرید کر آئیوری کوسٹ (Ivory Coast) اور گھانا (Ghana) میں کافی (Cocoa) کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے بھیجا جن سے زبردستی ہفتے میں 80 سے 100 گھنٹے کام لیا جاتا رہا۔ اس خبر کے نشر ہونے کے بعد صحت اور مزدوروں کی عالمی تنظیموں نے نیسلے پر شدید تنقید کی۔ بہرکیف نیسلے نے کبھی اس خبر کو تسلیم نہیں کیا اور مزدور قوانین کی خلاف ورزی کرنے والے فارمز سے اپنے تعلق کی صداقت کو ہمیشہ رد کیا۔83

مزدوروں کا استحصال

حال ہی میں نیسلے نے تھائی سمندری خوراک پر کام کرنے والے مزدوروں کا ''غلام مزدور'' ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ سال بھر کی تحقیقات کے بعد نیسلے نے انکشاف کیا کہ اس کی مصنوعات کے لیے خام مال کی فراہمی میں غلام مزدور کام کررہے تھے جنھیں سبز باغ دکھا کر مختلف مقامات سے خرید کر تھائی سمندری خوراک کے شعبے میں کام کروایا جارہا تھا۔ یہ مزدور جبری مشقت پر انتہائی برے حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ وہیں کام کرنے والے ایک مزدور ماہی گیر نے بتایا کہ بعض اوقات شکار کے لیے بھاری بھرکم جال کو سمندر میں پھینکتے ہوئے مزدور خود بھی سمندر میں گر کر غائب ہوجاتے تھے۔ ایک اور مزدور نے اپنی ابتری کی داستان بتاتے ہوئے کہا کہ ''دس سال کام کرنے کے باوجود بھی مشکل سے ہی زندہ ہوں''۔ امریکہ میں نیسلے کے خلاف تھائی لینڈ میں غلام مزدور اور آئیوری کوسٹ میں بچوں سے مزدوری کروانے پر اگست 2015 سے مقدمہ چل رہا ہے۔84

یونین سازی میں رکاوٹیں

نیسلے کی اپنے مزدوروں پر یونین سازی کرنے پر دھمکی دینے اور یونین لیڈر و ممبران کے قتل کی خبر بھی کچھ عرصے قبل سامنے آئی۔ اس حوالے سے کولمبیا کی آٹھ شہادتیں بھی قابل ذکر ہیں لیکن ہمیشہ کی طرح تحقیقات میں نیسلے کا اس قتال سے کوئی تعلق نکل کر سامنے نہیں آیا۔85 واضح رہے کہ یونین سازی کرنا مزدوروں کا قانونی حق ہے۔

خلاصہ

نیسلے پاکستان میں اپنی بہت سی مصنوعات کا کاروبار کرتا ہے جو اسے بیش بہا منافع کما کر دیتی ہیں۔ ان مصنوعات نے نیسلے کو پاکستان کی ایک بڑی کمپنی بنا رکھا ہے۔ سب سے اہم پہلو یہ کہ نیسلے اور اس جیسی کمپنیاں ان بنیادی ضروریات کو کہ جن پر ہر شہری کا بنیادی حق ہے، جس میں دودھ اور پانی جیسی اہم ترین اشیاء شامل ہیں، تجارتی مصنوعات بنا کر نہ صرف منڈی میں بیچنے کے لیے لے آئی ہیں بلکہ ان بنیادی ضروریات کے روایتی اور سرکاری طریقہء حصول کو کم حیثیت قرار دینے میں مسلسل سرگرم عمل ہیں۔ سرکار کو جہاں اس کی بہتری کے لیے اقدامات کرنے چاہیے تھے، اس نے ان کمپنیوں کو جگہ بنا کر دی۔ یقیناً ہماری حکومت اپنے آقاؤں کی نیولبرل پالیسیوں کے تحت نیسلے اور اس جیسی کئی کمپنیوں کے ہاتھوں یرغمال ہے۔

پاکستان میں صاف اور صحت افزوں پینے کے پانی کی فراہمی کا نظام خراب ہونا بلکہ نہ ہونا بھی نیسلے اور اس جیسی کمپنیوں کا جواز قائم رکھنے اور ان کی مصنوعات کے فروغ و فروخت کا باعث ہے اور کوئی قباحت نہیں کہ یہ کمپنیاں ان انتظامات کی بہتری میں رکاوٹیں حائل کرنے کا بھی باعث ہوں کہ اگر فرہمی آب کا نظام بہتر ہوگیا تو ان کمپنیوں کی مصنوعات کی مانگ میں کمی ہونے کے باعث ان کمپنیوں کے منافع میں بھی کمی واقع ہوگی۔ اگر ہمارے نلکوں میں صاف ستھرا پانی آرہا ہوگا تو کون ان کمپنیوں سے پانی کی مہنگی بوتلیں خریدے گا؟

نیسلے ایک طرف تو پھلوں کے رس، دودھ، دہی، ملائی اور پانی سمیت دیگر اشیاء کو ڈبوں میں پیک کرکے بیچ رہا ہے اور دوسری طرف ان کے ایک دم خالص ہونے اور عوام کی صحت کا ضامن ہونے کا دعوٰی بھی ازخود کرتا ہے۔ حقیقت پسند اور شعور کے آئینے میں یہ دونوں باتیں آپس میں متضاد دکھائی دیتی ہیں۔ مزید یہ کہ ان مصنوعات کی تیاری میں کسانوں، مزدوروں، ماحولیات، روایات اور قدرتی ذخائر کا استحصال وہ سیاہ بادل ہیں جو منافع کی چکا چوند میں دکھائی نہیں دیتے مگر حقیقت یہ ہے

کہ بنیادی ضروریات زندگی جب کاروبار کی صورت اختیار کرتی ہیں تو زیست فاقوں اور پیاس سے مرتی ہے جس کا المناک مظاہرہ سندھ کے علاقے تھر، قحط بنگال اور افریقہ کے علاقوں میں ماضی میں رونما ہونے والے حالات سے بخوبی ہوتا ہے۔ مستقبل میں اگر ان حالات پر قابو نہیں پایا گیا تو عوام کا یہی مقدر رہے گا۔

لفظ آخر

کسی وقت میں ریاست طاقتور ادارہ ہوا کرتی تھی مگر آج کی حقیقت کچھ تبدیل ہوگئی ہے۔ یہ بین الاقوامی کمپنیاں ریاست سے زیادہ طاقتور بن گئی ہیں۔ یہی وہ کمپنیاں ہیں جو اپنے مفاد کے خاطر ملکوں کی حکومتیں تک بدلوا دیتیں ہیں۔ قانون میں تبدیلیاں لے آتی ہیں۔ ملکوں کے مابین جنگیں کروا دیتی ہیں۔ ضرورت یہ جاننے کی ہے کہ ہمارے مد مقابل کون کھڑا ہے؟ کون ہے جس کا مفاد اور ہمارا مفاد آپس میں ایک نہیں بلکہ متضاد ہے؟

حوالہ جات

1. Nestle. "Good food, good life: Celebrating 150 years of Nestle." Nestle, Jan 1, 2016. Accessed from http://www.nestle.com/media/newsandfeatures/nestle-150-years

2. DuBois, Shelley. "Nestle's Brabeck: We have a 'huge advantage' over big pharma in creating medical foods." Fortune, April 1, 2011. Accessed from http://archive.fortune.com/2011/04/01/news/companies/nestle_brabeck_medical_foods.fortune/index.htm

3. Fortune. "Nestle." Fortune Global 500, 2015. Accessed from http://fortune.com/global500/nestle-70/

4. Nestle. "Annual Report 2014." Accessed from https://www.nestle.com/asset-library/documents/library/documents/annual_reports/2014-annual-report-en.pdf

5. DuBois, Shelley. "Nestle's Brabeck: We have a 'huge advantage' over big pharma in creating medical foods."

6. United Nation Conference on Trade and Development (UNCTAD). "World Investment Report 2004: The shift towards services." United Nations, New York, Geneva 2004, p. 279. Accessed from http://unctad.org/en/Docs/wir2004_en.pdf

7. Nestle. "About Nestle Pakistan Ltd." Nestle. Accessed from http://boi.gov.pk/UploadedDocs/Downloads/SuccessStories/Nestle.pdf

8. Nestle. "Offices & factories." Nestle. Accessed from http://www.nestle.pk/aboutus/nestleinpakistan/offices-and-factories

9. Nestle. "About Nestle Pakistan Ltd." Nestle.

10. Nestle Pakistan. "About us." Nestle. Accessed from https://nestlepakistan.wordpress.com/about/

11. Rosemann, Nils. "Drinking water crisis in Pakistan and the issue of bottled water: The case of Nestle's Pure Life." Swiss Coalition of Development Organisations and Action Aid Pakistan, April 2005, p. 18. Accessed from http://www.alliancesud.ch/en/policy/climate/downloads/nestle-pakistan.pdf

12. Ibid.

نیسلے اشیاء کی قیمتیں جہاں بھی استعمال کی گئی ہیں وہاں درج ذیل حوالہ سے مدد لی گئی ہے۔

13. Doorstep. "Nestle Milk Pak 250ml." Doorstep. Accessed from http://www.doorstep.pk/Nestle-Milk-Pak-250ML

14. AwamiWeb. "Nestle Milkpak price down to Rs. 110." AwamiWeb, Mar. 25, 2015. Accessed from http://www.awamiweb.com/nestle-milkpak-price-down-to-rs-110-78331.html

15. Nestle. "Ask Nestle." Nestle. Accessed from http://www.nestle.pk/brands/ask-nestle

16. Nestle. "Nestle Pure Life." Nestle. Accessed from http://www.nestle.pk/brands/bottledwater/nestle-pure-life-detail

17. Rosemann, Nils. "Drinking water crisis in Pakistan and the issue of bottled water: The case of Nestle's Pure Life." P. 22

18. Ibid.

19. Euromonitor International. "Soft drinks: Bottled water in Pakistan." Euromonitor International, June 2015. http://www.euromonitor.com/bottled-water-in-pakistan/report

20. Rosemann, Nils. "Drinking water crisis in Pakistan and the issue of bottled water: The case of Nestle's Pure Life." P. 21.

21. Shoprex. "Nestle water 5l bottle." Shoprex. Accessed from http://shoprex.com/foods/grocery/nestle-water-5l-bottle-mpid8767

22. PakReviews. "Nestle juices - rise & shine to life." Pakreviews. Accessed from http://www.pakreviews.com/nestle-juices-rise-shine-life

23. Commerce Solution. "Report on Nestle water Marketing strategy." Commerce Solution, July 5, 2010. Accessed from http://commerceplus.blogspot.com/2010/07/report-on-nestle-water-marketing.html

24۔ احمد، جنید۔ "مال مویشی شعبے پر بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ"۔ چیلنج، جلد8، شمارہ2، مئی تا اگست، 2015، صفحہ 25۔

25. USAID and Dairy and Rural Development Foundation. "Dairy Project." USAID Dairy Project, 2012. Accessed from http://www.dairyproject.org.pk/themes/html/

26۔ احمد، جنید۔ "مال مویشی شعبے پر بین الاقوامی کمپنیوں کا قبضہ"۔

27. Nestle. "Rural develpment." Nestle. Accessed from http://www.nestle.pk/csv/ruraldevelopment/rural-development

28۔ ان بنیادی ٹیسٹ میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

Alcohol-Precipitate Test, Clots on Boiling, Organoiptic Test, Starch, Glucose, Salt Test, Sorbitol, Fat Test, Solids Non Fat (SNF), Acidity Test, pH and Detergent

29. Gallup and Gilani Pakistan. "Milk consumption in Pakistani households: Finding from a nation wide surway." Gallup & Gillani Pakistan, May 5, 2011, p. 7. Accessed from http://www.gilanifoundation.com/homepage/30years/MilkConsumption.pdf

30. Ibid, p. 10.

31. The News. "Nestle partners with PMYBL." The News International, Lahore, Pakistan, May 23, 2015, p. 17. Accessed from http://www.thenews.com.pk/print/41920-nestle-partners-with-pmybl

32. Nestle Pakistan. "Chaunsa project." Nestle Pakistan. Accessed from http://www.nestle.pk/csv/ruraldevelopment/chaunsa-project

33. Pakistan Council of Science & Industrial Research (PCSIR). "Food & Biotechnology Research Centre." PCSIR, Ministry of Science & Technology, Government of Pakistan. Accessed from http://www.pcsir.gov.pk/fbrc.html

34. Nestle. "Nestle, PCSIR to hold seminar to mark World Health Day." Nestle, Lahore, Pakistan, Apr. 6, 2015. Accessed from http://www.nestle.pk/media/pressreleases/Nestle-PCSIR-to-hold-seminar-to-mark-World-Health-Day

35. Nestle Pakistan. "Reports for the nine months period ended September 30, 2015." Nestle, Lahore, Pakistan, p. 3. Accessed from http://www.nestle.pk/asset-library/documents/

52. Gucciardi, Anthony. "Nestle CEO: Water is not a human right, should be privatized." Natural Society, April 23, 2013. Accessed from http://naturalsociety.com/nestle-ceo-water-not-human-right-should-be-privatized/
53. The Huffington Post. "GMO protest." The Huffingtonm Post. Accessed from http://www.huffingtonpost.com/news/gmo-protest/
54. Huffpost Green. "Washington to vote on GMO labeling law." The Huffington Post, November 05, 2013. Accessed from http://www.huffingtonpost.com/2013/11/05/washington-gmo-labeling-vote_n_4217836.html
55. Sarich, Cristina. "64 nations say no to GMO, yet US govt nears illegal GMO labeling." Natural Society. July 30, 2015. Accessed from http://naturalsociety.com/64-nations-say-no-to-gmo-yet-us-govt-nears-illegal-gmo-labeling/
56. Corporate Watch. "Promoting of GM food." Corporate Watch, June 10, 2005. Accessed from https://corporatewatch.org/company-profiles/nestl%C3%A9-sa-corporate-crimes#gm
57. Just-food. "Thailand: Nestle threatened with boycott over GM ingredients." Just-food, March 17, 2003. Accessed from http://www.just-food.com/news/nestl%C3%A9-threatened-with-boycott-over-gm-ingredients_id68303.aspx
58. Kloppenburg, Jack Ralph. "First the seed: The political economy of plant biotechnology, 1492-2000." University of Wisconsin, 2004.
59. AFP. "India state files case against Nestle for Maggi noodles lead recall." The Express Tribune, June 1, 2015, p. 8. Accessed from http://tribune.com.pk/story/895273/india-state-files-case-against-nestle-for-maggi-noodles-lead-recall/
60. Tirmizi, Farooque. "Frugal innovation: Pharmagen eyes affordable bottled water market." The Express Tribune, June 5, 2013. Accessed from http://tribune.com.pk/story/558819/frugal-innovation-pharmagen-eyes-affordable-bottled-water-market/
61. Ebrahim, Zofeen T. "In Pakistan, bottled water may be unfit to drink." Dawn, June 20, 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1189188
62. Tirmizi, Farooque. "Frugal innovation: Pharmagen eyes affordable bottled water market."
63. Pakistan Council of Research in Water Resources. "Quarterly report: Bottled water quality, July - September, 2015." Pakistan Council of Research in Water Resources, Ministry of Science and Technology. Accessed from http://www.pcrwr.gov.pk/Btl_wr_report/Bottled%20water%20July-September%202015.pdf
64. Rosemann, Nils. "Drinking water crisis in Pakistan and the issue of bottled water." P. 20.
65. Alkaline Water Plus. "Analyzing & Comparing brands of bottled water." Alkaline Water Plus. Accessed from https://alkalinewaterplus.com/analyzing-comparing-brands-of-bottled-water/
66. Rosemann, Nils. "Drinking water crisis in Pakistan and the issue of bottled water." P. 21.
67. Gucciardi, Anthony. "Nestle CEO: Water is not a human right, should be privatized."
68. MCPS. "The life of plastic bottle." MCPS. Accessed from http://www.montgomeryschoolsmd.org/uploadedfiles/curriculum/outdoored/programs/waterbottlefactpages.pdf
69. Nestle Waters. "Creating shared value report." Nestle Waters, 2011, p. 24. Accessed from http://www.nestle.com/asset-library/documents/library/documents/about_us/nestl%C3%A9_waters_csv_report_2011.pdf

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 6 پر دیکھیں)

financial_reports/nine-months-ended-2015.pdf
36. Jamal, Nasir. "Fall in consumer spending?" Dawn, Dec 7, 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1224592
37. Nestle Pakistan. "What is creating shared value?" Nestle Pakistan. Accessed from http://www.nestle.pk/csv/whatiscsv
38۔ نیسلے۔ "نیسلے کارپوریٹ کے کاروباری اصول"۔ جون 2010، صفحہ 5۔ مواد اس ویب سائٹ سے حاصل کیا گیا ہے: http://www.nestle.com/asset-library/documents/library/documents/corporate_social_responsibility/nestle_corporate_business_principles_urdu_pakistan.pdf
39. Nestle Pakistan. "Creating shared value." Nestle Pakistan. Accessed from http://www.nestle.pk/csv/whatiscsv/home
40. Acree, S. F. "On the detection of Formaldehyde in milk." Johns Hopkins University, Baltimore, Maryland, United States, February 26, 1906. Accessed from http://www.jbc.org/content/2/1/145.full.pdf
41. New York State Department of Agriculture And Markets. "Sampling producer milk circular 278." New York State Department of Agriculture And Markets, Division of Milk Control & Dairy Services, Albany, New York, USA, p. 28. Accessed from http://www.agriculture.ny.gov/DI/Laws%20in%20PDF/Sampling%20Producer%20Milk.pdf
42. TheNetwork for Consumer Protection. "Formalin in Nestle Pakistan milk." Consumer Report, Release No: 017/06, TheNetwork for Consumer Protection, Dec. 13, 2016, p. 1. Accessed from http://www.waba.org.my/resources/wabalink/pdf/Issue42/Insert1_42.pdf
43. National Cancer Institute. "Formaldehyde and cancer risk." National Cancer Institute, National Institute of Health, U.S. Department of Health and Human Services. Accessed from http://www.cancer.gov/about-cancer/causes-prevention/risk/substances/formaldehyde/formaldehyde-fact-sheet
44. International Agency for Research on Cancer. "IARC Monographs on the Evaluation of Carcinogenic Risks to Humans Volume 88: Formaldehyde, 2-Butoxyethanol and 1-tert-Butoxypropan-2-ol." International Agency for Research on Cancer, World Health Organisation, Lyon, France, June 2006. Accessed from http://monographs.iarc.fr/ENG/Monographs/vol88/mono88.pdf
45. National Toxicology Program. "Report on Carcinogens, Twelfth Edition." National Toxicology Program, U.S. Department of Health and Human Services, June 10, 2011. Accessed from http://ntp.niehs.nih.gov/go/roc12
46. News. "Formaldehyde confirmed as known human carcinogen." The National Academies of Science, Engineering and Medicine, National Research Council, August 8, 2014. Accessed from http://www8.nationalacademies.org/onpinews/newsitem.aspx?RecordID=18948
47. U.S. Department of Health and Human Services. "Household products database." U.S. Department of Health and Human Services. Accessed from http://householdproducts.nlm.nih.gov/cgi-bin/household/list?tbl=TblManufacturers&alpha=N
48. Edward, Dr. "The hidden Formaldehyde in everyday products." Global Healing Centre, October 21, 2015. Accessed from http://www.globalhealingcenter.com/natural-health/formaldehyde/
49. U.S. Department of Health and Human Services. "Household products database." Accessed from http://householdproducts.nlm.nih.gov/cgi-bin/household/list?tbl=TblBrands&alpha=A
50. U. S. Department of Health and Human Services. "Household products database." Accessed from http://householdproducts.nlm.nih.gov/cgi-bin/household/brands?tbl=manu&id=14021
51. TheNetwork for Consumer Protection. "Formalin in Nestle Pakistan milk." P. 2.

ہمارے حکمران- جاگیردار یا سرمایہ دار!

تحریر: آصف خان

مئی 2015 میں ضلع ہری پور سمیت ملک کے کئی اضلاع میں بلدیاتی انتخابات ہوئے جن میں بڑے پیمانے پر جماعتوں میں مقابلہ سازی اور سیاسی اختلافات میں شدت نظر آئی۔ سیاسی جماعتوں کے امیدواروں کے درمیان شدید مقابلہ سازی کا اثر ان کے ارکان پر بھی واضح نظر آیا۔ جس سے آبادی میں رہنے والوں میں کشیدگیاں اور برہمی نظر آئی۔ عوام میں بددلی اور ایک دوسرے سے ناچاکی، ایک غیر اطمینان بخش فضا تھی۔ خاص کر کے اگر عوامی سوچ کو اس نظر سے ترقی دیے جانے کا خیال ہو کہ مضبوط عوامی طاقت ہی صرف اصلی جمہوریت کی پاسبان ہے اور اسی کی طاقت سے عوامی آسودگی اور دیرپا ترقی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس تناظر میں یہ مضمون لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ موجودہ پاکستان برطانیہ کی نوآبادیات کا حصہ تھا اور آج کے موجودہ حکمران طبقہ کو بنانے میں برطانوی راج کا اہم کردار تھا۔ جو بلاشبہ ہماری عوامی اور قومی ترقی میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ پاکستان میں اقتصادی ترقی کے عمل نے کسان مزدور طبقے پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے ہیں۔ آزاد ہونے والے دیگر نوآبادیاتی ممالک کی طرح پاکستان بھی ایک پسماندہ ملک ہے جہاں ایک طرف بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کا غلبہ ہے تو دوسری طرف پاکستان کے محنت کش عوام مختلف گروہوں میں تقسیم ہیں۔

پاکستان میں معاشی، معاشرتی، سیاسی اور ماحولیاتی بحران کی وجہ تقریباً دو سو سالوں پر محیط نوآبادیاتی نظام ہے، آج پاکستان آزاد تو ہوگیا ہے مگر اس کا انتظامی ڈھانچہ اسی سیاسی نظریے پر کام کررہا ہے جو ہمارے انگریز آقاؤں نے استعمال کیا تھا یعنی ڈیوائیڈ اینڈ رول (divide and rule) جس کا مطلب تھا کہ عوام کو مختلف جھگڑوں اور فساد کے ذریعے آپس میں تقسیم کرو تاکہ ان پر حکمرانی کرنا آسان ہو۔ پاکستان بننے کے بعد اس کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ آئی جو انگریز کی باقیات تھے جنہیں انگریز نواز کر گئے تھے اور یہ طبقہ اب تک اپنے مفادات کی خاطر برطانوی راج کے بتائے ہوئے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ فرق کچھ شاید یہ ہوسکتا ہے کہ اب برطانیہ کے علاوہ بھی سامراجی طاقتیں ہماری سرحدوں میں پنجے گاڑ کر بیٹھی ہیں اور لوٹ مار میں اب ان کا بھی حصہ ہے۔ پاکستان میں بڑھتی ہوئی معاشی اور سیاسی ناانصافیوں کے خاتمے کے لیے لازم ہے کہ ہم حاکم طبقے کی چالوں کو سمجھیں جس کے لیے ان کی سیاسی اور معاشی طاقت کے ذرائع کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس حوالے سے ضلع ہری پور کے بااختیار سیاسی خاندانوں کے بارے میں کچھ انٹرویو کیے گئے جس میں مقامی لوگوں سے معلومات اکھٹی کی گئیں۔

چھوٹے اور بے زمین کسانوں کا ایک منظم گروہ پاکستان کسان مزدور تحریک (پی کے ایم ٹی) کے نام سے ملک بھر میں کام کررہا ہے۔ پی کے ایم ٹی کے ساتھیوں نے آپس میں بات چیت کرکے یہ تعین کیا کہ کون سے ایسے لوگ ہوں گے جو کہ ضلع ہری پور کے بااختیار سیاسی خاندانوں کے بارے میں تفصیل سے جانتے ہوں۔ اس کے بعد تقریباً دس افراد کا چناؤ ہوا جو مختلف علاقوں سے تھے، منتخب کیے گئے افراد میں ہری پور شہر غازی کے ایک کالج میں پڑھانے والے استاد، چک منیم کے ایک گاؤں کا فرد، یونین کونسل کے ممبران اور پرائمری اسکول کے استاد شامل تھے۔

تین سیاسی خاندانوں کے بارے میں معلومات لی گئیں ترین، راجگان اور پیر عالم زیب شاہ۔ اس مضمون میں صرف ترین اور راجگان خاندان کے بارے میں حاصل کردہ معلومات درج کی جارہی ہیں۔ عام لوگوں سے بات چیت کے علاوہ کچھ کتابوں اور ویب سائٹس پر دی گئی معلومات کو بھی اس مضمون کا حصہ بنایا گیا ہے۔

ترین خاندان اور راجگان خاندان پاکستان بننے سے پہلے سے بااثر خاندانوں میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی رہائش ہری پور میں ہے اور انتخابات کے دوران ان کے خاندان کے لوگ عام نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہری پور کی روایت کے مطابق شادی بیاہ اور فوتگیوں میں ان خاندانوں کے افراد عام لوگوں کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً گاؤں حطار میں ریزم خان ولد محمد مسکین کے بھائیوں کی شادی پر عمر ایوب خان شامل ہوئے تھے جن سے پی کے ایم ٹی کے ساتھیوں کی بات بھی ہوئی تھی۔ اس طرح آبادی کے باشندوں کا ان خاندانوں سے آمنا سامنا رہتا ہے۔

ترین خاندان

میرداد خان

رسالدار میرداد خان صوبہ خیبر پختون خواہ کے ضلع ہری پور کے گاؤں ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ وہ سابق فوجی صدر ایوب خان اور سردار بہادر خان کے والد تھے جو ابتدائی تعلیم کے بعد چھوٹی عمر میں ہی برطانوی فوج میں بطور سپاہی بھرتی ہوگئے۔ ہندوستان میں برطانوی فوج میں اپنی خدمات فراہم کیں اور آخر کو ایک رجمنٹ ہاڈسن ہارسیز میں رسالدار میجر کا عہدہ پایا۔[1] یہ عہدہ بغیر کمیشن کے افسران میں سب سے اعلیٰ عہدہ تھا۔

میرداد خان 1918 میں برطانوی فوج سے فارغ ہوئے اور انہیں ان کو تاج برطانیہ کی طرف سے طویل فوجی خدمات کے صلے میں آرڈر آف دا برٹش انڈیا (او بی آئی) سیکنڈ کلاس کا تمغہ اور خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔[2] 1932 میں میرداد خان کا اپنے آبائی گاؤں ریحانہ میں انتقال ہوا۔

سردار بہادر خان ترین[3]

سردار بہادر خان ترین رسالدار میر داد خان کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ 5 جولائی، 1908 کو ہری پور ہزارہ کے گاؤں ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ 1936 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کو بطور پیشہ اپنایا۔ 1939 میں وہ پہلی بار سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اگست 1943 سے 1946 تک اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ 1946 میں دوبارہ سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، بعد ازاں اسمبلی نے نہیں پاکستان کی مجلس دستور ساز میں اپنی نمائندگی کے لیے منتخب کیا۔ قیام پاکستان کے بعد سردار بہادر خان فروری، 1948 میں مجلس دستور ساز میں مسلم لیگ کے چیف وہپ (chief wip) مقرر ہوئے جس کی ذمہ داریوں میں جماعت کی قانون سازی کے حوالے سے ارکان کے ووٹ کو یقینی بنانا ہوتا ہے۔ اسی سال انھوں نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پاکستان کی نمائندگی کی اور وہ امور خارجہ اور دولت مشترکہ تعلقات کے نائب وزیر بھی رہے۔

سردار بہادر خان 1949 میں مرکزی وزیر مواصلات مقرر ہوئے۔ 1954 میں انہیں بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ کے طور پر تعینات کیا گیا۔ اگلے برس ان کو صوبہ سرحد کا وزیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ 1955 میں ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو وہ وزیر ترقیات کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ 1962 میں ایوب خان کے دور حکومت میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور قائد حزب اختلاف کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

1970 کے عام انتخابات میں سردار بہادر خان نے ایک بار پھر قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا مگر وہ خان عبدالقیوم خان سے شکست کھا گئے۔ 31 دسمبر، 1975 میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان پاکستان کے نامور ترین خاندان سے ہیں۔ محمد ایوب خان 14 مئی، 1907 کو ہری پور کے گاؤں ریحانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ رسالدار میر داد خان کے چھوٹے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم آبائی علاقہ سے حاصل کی، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے سے پہلے ہی انھوں نے برطانیہ کی نہایت نامور ملٹری تعلیمی ادارے سینڈ ہرسٹ میں داخلہ حاصل کیا اور امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوگئے۔[4] ایک تحریر ''جینٹل مین آف دا راج'' کے مطابق ''یہ تعلیمی ادارہ ہندوستان کیڈٹس کو ایسی خوراک دیتا تھا کہ وہ اشرافیہ کے طور طریقوں کو اپنالیں''۔[5] 1928 میں انہیں فوج میں کمیشن ملا، دوسری جنگ عظیم کے دوران کیپٹن کی حیثیت سے حصہ لیا اور برما کے محاذ پر ذمہ داریاں انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد اپنی خدمات پاکستان کے حوالے کر دیں۔ 1948 میں انہیں میجر جنرل کا عہدہ دے کر مشرقی پاکستان میں آفیسر کمانڈنگ مقرر کیا گیا۔[6]

6 ستمبر، 1951 کو انہیں پاکستانی فوج کا پہلا مسلمان اور پاکستانی کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ 17 جنوری، 1951 کو انھوں نے یہ عہدہ سنبھالا۔ 27 اکتوبر، 1958 کو جنرل ایوب خان نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر کے ساتھ صدر پاکستان کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔ اب وہ بری فوج کے کمانڈر انچیف، تینوں افواج کے سپریم کمانڈر اور صدر پاکستان بھی تھے۔[7] 1974 میں جنرل ایوب خان کا انتقال ہوا۔

گوہر ایوب خان[8]

پاکستان کے سابق فوجی صدر اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے فرزند ہیں۔ ایوب خان جب صدارت پر فائز ہوئے تو بری فوج کی طرف سے ان کے بیٹے کیپٹن گوہر ایوب بطور اے ڈی سی (aide de camp) تعینات ہوئے لیکن جلد ہی گوہر ایوب نے فوج سے رخصت لے لی اور نجی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ ان کی جگہ ایوب خان کے دوسرے بیٹے کیپٹن ڈاکٹر اختر ایوب کو والد کا اے ڈی سی بنا کر ایوان صدر لایا گیا۔

گوہر ایوب خان کی شادی لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خان کی بیٹی، کلثوم سیف اللہ کی بھتیجی اور لیفٹیننٹ جنرل علی قلی خان اور صنعت کار رضا قلی خان کی بہن سے ہوئی۔ جنرل حبیب اللہ خود بھی پاکستان کے ایک بڑے سیاسی اور کاروباری گھرانے بی بو جی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ بی بو جی کئی طرح کی اشیاء کی پیداوار اور خدمات سے منسوب ہے جن میں ٹائر، ٹیکسٹائلز اور انشورنس شامل ہیں۔[9] یہ خاندان (جو کہ گندھارا کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے) پاکستان کے 22 امیر ترین خاندانوں میں شامل ہے۔

گوہر ایوب کے والد جنرل ایوب خان جب اپنے عہدے سے برطرف ہوئے تو کہا جاتا ہے کہ اس وقت وہ 20 ملین امریکی ڈالرز تک کے مالک تھے۔ اس شعبے میں گوہر ایوب خان بھی اپنے والد سے پیچھے نہیں رہے، 1968 کے اختتام پر وہ کئی کمپنیوں کے چیئرمین، ایم ڈی اور ڈائریکٹر تھے جن میں ریحانہ وولن، عروسہ انڈسٹریز اور ہاشمی کین لمیٹڈ کے چیئرمین، گندھارا انڈسٹریز لمیٹڈ کے مینجنگ ایجنٹ کے ایم ڈی اور گندھارا منرل اینڈ ٹریڈنگ کمپنی اور جانانہ ڈی مالوچو ٹیکسٹائل ملز کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ گوہر ایوب خان نے اپنے سسر جنرل حبیب خان کے ساتھ مل کر امریکہ میں گندھارا موٹرز کا کاروبار شروع کیا تھا جو جلد ہی گندھارا انڈسٹریز میں تبدیل ہوگئی۔ بھٹو حکومت کے زمانے میں کئی نجی کمپنیوں کو حکومت نے قومیا (nationalize) لیا جس میں گندھارا انڈسٹریز بھی شامل تھی لیکن گوہر ایوب نے گندھارا انڈسٹریز میں موجود اپنے حصص (شیئرز) نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ اور انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان کو اگست 1969 میں اپنے والد ایوب خان کے حکومت سے الگ ہونے کے بعد ہی بیچ دیے تھے۔[10]

گوہر ایوب خان نے پہلی دفعہ 1965 میں قومی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لیا جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد 1970 میں پاکستان قومی اتحاد کے

ٹکٹ پر قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور اس میں بھی کامیاب ہوئے۔ 1985 میں بھی الیکشن میں کامیابی حاصل کی، 1990 کے عام انتخابات میں گوہر ایوب اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور قومی اسمبلی کے اسپیکر بن گئے۔

1997 کے عام انتخابات میں گوہر ایوب قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہیں اس بار وزارت خارجہ اور پانی، بجلی کا قلم دان بھی دیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں 2002 کے انتخابات میں گوہر ایوب انتخابات میں لڑنے کے لیے مقررہ تعلیمی معیار پر نہ اتر پائے یعنی ان کے پاس بی اے کی ڈگری موجود نہ تھی اس وجہ سے انتخابات میں حصہ نہیں لیا لیکن انہوں نے اپنی جگہ اپنے بیٹے عمر ایوب اور اہلیہ زیب گوہر کو انتخاب میں کھڑا کر دیا۔[11] ان انتخابات میں عورتوں کی مخصوص نشیست پر زیب گوہر ایوب قومی اسمبلی کی رکن بننے میں کامیاب ہوگئیں۔

سیاست میں حصہ لینے کے علاوہ گوہر ایوب کی اہلیہ اپنے والد جنرل حبیب اللہ کی کئی کمپنیوں کے بورڈ پر بیٹھتی تھیں۔ ان کمپنیوں میں بنو وولن ملز لمیٹڈ،[12] یونیورسل انشورنس کمپنی لمیٹڈ، بابری کاٹن ملز اور جانانہ ڈی مالوچو (Janana De Malucho) ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ شامل ہیں،[13] یہ خیال رہے کہ گوہر ایوب کے اپنے سسرال سے کئی اور رشتہ داریاں بھی بن گئی ہیں۔ مثال کے طور پر گوہر ایوب نے اپنے ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی شادی سیف اللہ خاندان میں کی ہے جو کہ پاکستان کا ایک اور نامور صنعتی خاندان سیف گروپ ہے۔ اس گروپ کو مضبوط کرنے میں گوہر زیب کی پھوپھی کلثوم سیف اللہ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس گروپ کے مالکان میں جاوید سیف اللہ خان اور انور سیف اللہ خان ہیں جو بالترتیب سیف گروپ کے چیئرمین اور شریک چیئرمین ہیں۔[14] گوہر ایوب نے اپنی بیٹی کی شادی کلثوم سیف اللہ کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر اقبال سیف اللہ سے کی ہے اور بیٹے عمر ایوب کی شادی کلثوم سیف اللہ کی پوتی (انور سیف اللہ کی بیٹی) سے کی ہے۔ خیال رہے کہ انور سیف اللہ سابق صدر غلام اسحاق خان کے داماد بھی ہیں۔[15]

عمر ایوب خان

سابق فوجی صدر جنرل ایوب خان کے پوتے اور سابق وزیر خارجہ اور اسپیکر قومی اسمبلی گوہر ایوب خان کے بیٹے اور لیفٹیننٹ جنرل حبیب اللہ خان کے نواسے ہیں۔ عمر ایوب خان 2002 میں جنرل مشرف کے دور میں مسلم لیگ ق کے ٹکٹ سے رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور وزیر مملکت برائے خزانہ کا قلم دان انہیں ملا۔ اس کے بعد دوبارہ مسلم لیگ ن کے ٹکٹ سے رکن قومی اسمبلی بنے۔

مقامی لوگوں کے مطابق عمر ایوب سرمایہ دار بھی ہیں اور جاگیر دار بھی ہیں اسلام آباد شہر میں ان کے پلازے اور منڈیاں ہیں اس کے علاوہ ہری پور میں ان کی سیکڑوں کنال زمین ہے۔ عمر ایوب خان نے انتخابات کے وقت الیکشن کمیشن میں اپنے اور اپنے خاندان کے جو اثاثے ظاہر کیے اس کے مطابق ان کی جن کمپنیوں میں کاروباری شراکت ہے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

نواسن پیک، اے کے ڈی سیکورٹی پرائیویٹ لمیٹڈ، سلسلہ کمیونیکیشن، اورین انٹرنیشنل، جے ایس بینک، نواجین پرائیویٹ لمیٹڈ، (Novagene Pvt Ltd.) نادرن کمیونیکیشن، کوہاٹ ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ۔[16] عمر ایوب خان یونیورسل انشورنس کمپنی لمیٹڈ کے چیف آپریٹنگ افسر بھی ہیں جس کے بورڈ پر ان کی والدہ اور دو ماموں رضا قلی خان خٹک اور لیفٹیننٹ جنرل علی قلی خان خٹک[17] بھی اپنی خدمات فراہم کررہے تھے۔[18]

اس کے علاوہ راولپنڈی، اسلام آباد، ہری پور، ایبٹ آباد میں کئی بنگلے بھی ہیں۔ ان تمام اثاثہ جات کی مالیت انھوں نے 329,451,183 روپے (یعنی تقریباً 33 کروڑ روپے) ظاہر کی ہے۔[19] عمر ایوب نے ایک بڑے سرمایہ دار گھرانے میں شادی کی۔ عمر ایوب کی بیوی انور سیف اللہ کی بیٹی ہیں اور پاکستان کے سابقہ صدر غلام اسحاق خان کی نواسی ہیں۔ انور سیف اللہ خان پیپلز پارٹی (کے پی کے) کے صوبائی صدر ہیں اور کئی بار وفاقی وزیر اور سینیٹر بھی رہ چکے ہیں۔

یوسف ایوب خان

فیلڈ مارشل ایوب خان کے پوتے اور مرحوم شوکت ایوب کے صاحبزادے ہیں اور عمر ایوب خان کے چچا زاد بھائی ہیں۔ 1988 میں پہلی بار صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ 1993 میں ایک بار پھر صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ یوسف ایوب خان 1997 میں بھی اس نشست پر کامیاب ہوئے پر 2002 میں انہیں شکست ہوئی۔ 2005 میں انھوں نے بلدیاتی انتخابات میں حصہ لیا اور ضلع ہری پور کے ناظم منتخب ہو گئے۔[20] ستمبر 2014 کے ایک بائی الیکشن میں حصہ نہ لے سکے کیونکہ ان کے پاس بی اے کی جعلی ڈگری تھی۔[21] یوسف ایوب خان پاکستان تحریک انصاف کے صوبائی صدر ہیں۔

ہری پور شہر میں یہ عام ہے کہ یوسف ایوب نے ایک شادی اپنے چچا اختر ایوب کی بیٹی سے کی ہے اور دوسری شادی راجگان خاندان میں راجہ اعجاز کی بہن اور راجہ سکندر زمان کی بھانجی سے کی ہے۔ گو کہ اختر ایوب صاحب کی بیٹی سے شادی کی کوئی خبر موجود نہیں لیکن راجہ سکندر زمان کی بھانجی سے شادی کی خبر کی تصدیق موجود ہے۔[22]

اختر نواز خان[23]

گوہر ایوب خان کے ماموں زاد بھائی ہیں، یہ بھی عملی سیاست میں رہے ہیں۔ 1985 کے انتخابات میں اس وقت صوبہ سرحد سے سینٹ کے رکن منتخب ہوئے، ان کی ایک بیٹی کی شادی پنجاب کے مشہور چوہدری خاندان میں چوہدری ظہور الٰہی کے چھوٹے بیٹے چوہدری وجاہت حسین سے ہوئی ہے۔ یہ خاندان اس وقت پاکستان میں مسلم لیگ ق

کی سربراہی کررہا ہے۔

راجگان گکھڑ خاندان[24]

گکھڑوں کی تاریخ 1008 سے ملتی ہے۔ ان کے بارے میں دو خیال ہیں، ایک یا تو وہ فارسی نواب خاندان کا حصہ تھے، دوسرا یہ کہ وہ ایک ہندوستانی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے محمود غزنوی کے ساتھ جنگ کی۔ گکھڑوں کے چھ قبیلوں میں سے ایک سرنگل قبیلے سے ہری پور کے گکھڑوں کا تعلق ہے اور اس قبیلے کے سربراہ سلطان سرنگ تھے۔

اٹھارہویں صدی کے اوائل میں ہری پور کے علاقے پر سکھوں کی حکمرانی تھی۔ انگریزوں نے اس علاقہ پر قبضہ کرنے کے لیے طویل مدت تک لڑائی جاری رکھی۔ 1847 میں جب انگریزوں کا اس علاقہ پر مکمل قبضہ ہوا تو لاہور سے کیپٹن جیمز ایبٹ ہزارہ آئے، انگریزوں کو یہاں پر قبضہ قائم رکھنے میں بہت سی مشکلات پیش آئیں۔ جیمز ایبٹ نے ہزارہ کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملایا تاکہ سکھوں کے قبضے کو کمزور کیا جائے۔ ایبٹ نے بغیر کسی وجہ کے چھتر سنگھ گورنر ہزارہ پر چڑھائی کردی۔[25]

یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ 1857 کی جنگ آزادی کے دوران پنجاب کے امیر نوابوں اور زمینداروں کے کردار نے برطانوی راج کو قائم کرنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا۔ انہوں نے پنجاب میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے علاوہ دہلی جانے والی سڑکوں کو برطانوی فوج کے آمد و رفت کے لیے برقرار رکھا اور ساتھ ساتھ پیسہ اور ہتھیار بھی مہیا کیے۔[26] عقیل عباس جعفری بھی راجگان کے بارے میں کچھ ایسا ہی لکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ راجگان بدستور انگریز حکومت کے وفادار رہے اور 1857 کی جنگ آزادی میں انگریز کا بھر پور ساتھ دیا۔[27] تاریخ بتاتی ہے کہ انگریزوں سے ''وفاداری'' کا پھل نہایت میٹھا تھا۔

خان بہادر راجہ جہانداد[28]

راجہ جہانداد 1851 میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام راجہ حیدر بخش تھا۔ راجہ جہانداد کے تین بیٹے تھے، راجہ حیدر زمان، راجہ صفدر زمان اور راجہ منوچہر۔ راجہ حیدر زمان کی اولاد اب تک خاندان کی سربراہ ہے۔ راجہ جہانداد کا انتقال 1902 میں ہوا۔

برطانوی راج کے ایک اعلیٰ فوجی افسر چارلز فرانسیس میسی جو بنگال اسٹاف کور میں میجر تھے 1890 میں لکھی گئی اپنی ایک دستاویز میں بہت واضح طور پر راجگان اور برطانوی راج کے گٹھ جوڑ کو بیان کرتے ہیں۔[29] ان کے مطابق خانپور کے راجگان نے جیمز ایبٹ کا مکمل ساتھ دیا اور اسے افرادی قوت کے علاوہ مالی امداد بھی فراہم کی۔ یہاں تک کے ناصرف ہزارہ کے علاقے میں ایبٹ کا ساتھ دیا بلکہ انگریز فوج کی مدد کے لیے اپنے لوگوں کو ملتان بھی بھیجا تاکہ وہاں پر ہونے والی لڑائی میں انگریز کی مدد کریں۔ اس وفاداری کے نتیجے میں انگریز حکومت نے ایک لمبے عرصے تک صرف وعدے کیے کہ وہ گھکڑ قوم کے پرانے اثاثے جن میں جاگیروں کی ملکیت بھی شامل تھی واپس کردیں گے جوسکھ راج نے ان سے چھین لیے تھے۔

میسی مزید بیان کرتے ہیں:[30]

''خانپور کے گھکڑ جیمز ایبٹ سے مستقل جڑے رہے ... ہمیں مستقل رقوم فراہم کرتے رہے کہ جب کیپٹن جیمز ایبٹ کو پیسے کی اشد ضرورت تھی ... ''ہمیں (انگریزوں کو) مدد دیتے رہے اور 1857 میں انگریزوں کے ساتھ مخصوص وفاداری برتی۔ کرنل ویلس نے آخرکار 1872 میں انہیں نوازا جس کی وہ کم ہی امید کررہے تھے کیونکہ ان سارے واقعات کو لمبا عرصہ گزر چکا تھا۔ انہیں پہاڑی علاقوں کے ایک بہت بڑے حصے، پنج کاٹا کے علاقے اور بہروال میں 78 دیہاتوں کا مالک بنا دیا گیا اور ان میں جوالیان کا گاؤں راجہ جہانداد خان کے لیے قبیلے کے سربراہ کے طور پر مخصوص کیا گیا تاکہ وہ سربراہ کی حیثیت سے اخراجات یہاں سے حاصل کرسکیں۔ غدر میں انگریزوں کا ساتھ دینے پر حیدر بخش کے قریبی رشتہ دار (کزن) راجہ عطا خان اور محمود خان کو الگ الگ 600، 600 روپے کی جاگیریں ہمیشہ کے لیے دے دی گئیں۔ راجہ حیدر بخش اور راجہ گوہر خان کو ان کی جاگیر میں ہی اعزازی مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ راجہ جہانداد خان اور راجہ فیروز خان ان کے نمائندے تھے۔ (انگریزوں کے لیے) راجہ جہانداد خان مکمل طور پر وفادار اور قابل بھروسہ ہیں جن کو 1877 میں ایکسٹرا اسٹنٹ کمشنر کے طور پر تقرری دی گئی اور ان کی سالانہ تنخواہ 4,800 روپے ہے۔ وہ 1869 کی اگرور مہم کے دوران مستقل موجود رہے اور 1880 میں کابل میں سرلیپل گرفن کے ماتحت ایک سیاسی افسر (پولیٹیکل آفیسر) کے طور پر تعینات رہے جس کے عوض انہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا اور ان کی زندگی تک کے لیے 600 روپے کی جاگیر بھی دی گئی۔ ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر کے مطابق ضلع ہزارہ کا قبیلہ گھکر 16 خاندانوں پر مشتمل ہے جن کے پاس مجموعی طور پر 82,450 (تقریباً 83 ہزار) ایکڑز زمین ہے جس سے 23,447 روپے آمدنی (ریونیو) حاصل ہوتی ہے''۔

کیپٹن راجہ حیدر زمان

راجہ حیدر زمان خان بہادر راجہ جہانداد کے بیٹے تھے۔ راجہ حیدر زمان 1892 میں پیدا ہوئے۔ آپ کو حکومت برطانیہ نے وفاداری کے صلے میں بڑے بڑے تمغوں سے نوازا جن میں کنگ جارج سلور میڈل 1935، ایم بی ای (MBE) 1938 اور دہلی دربار میڈل شامل ہیں۔[31] راجہ حیدر زمان 1946 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سرحد کی قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ان کی وفات 23 جون، 1947 کو ہوئی۔[32]

راجہ سکندر زمان[33]

راجہ سکندر زمان گکھڑ چیف سلطان خان بہادر راجہ جہانداد کے پوتے کیپٹن حیدر زمان کے بیٹے تھے۔ راجہ جارج سکندر زمان 1934 میں پیدا ہوئے اور انہیں ''پیار'' سے جارج کہا جاتا تھا کیونکہ ان کی پیدائش کنگ جارج کے زمانے میں ہوئی۔ راجہ سکندر زمان نے تعلیم برن ہال اسکول ایبٹ آباد اور علی گڑھ سے حاصل کی۔ راجہ سکندر زمان نے اپنے چچا راجہ منوچہر کی بیٹی سے شادی کی۔

1979 میں راجہ سکندر زمان پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ) کے ٹکٹ پر سابق صدر جنرل ایوب کے بیٹے اختر ایوب کو شکست دے کر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1972 میں سرحد اسمبلی کے قائد حزب اختلاف مقرر ہوئے اور 1973 میں سرحد میں وزیر تعلیم کے فرائض انجام دیے۔ 1977 میں راجہ سکندر زمان پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور ان کے حصے میں وزارت زراعت کا قلم دان آیا۔ 1981 میں راجہ سکندر زمان کا ضیاالحق سے اتفاق ہوا اور انہیں پانی و بجلی کا وزیر مقرر کر دیا گیا۔ 1982 کے الیکشن میں راجہ سکندر کو گوہر ایوب کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ 1988 میں اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ سے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے 1999 میں انہیں صوبہ سرحد کا نگران وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ ان کا انتقال 2007 میں ہوا۔[34]

راجہ عامر زمان

مرحوم راجہ سکندر زمان کے بیٹے ہیں۔ 1993 میں مسلم لیگ (ج) کے ٹکٹ سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا جس میں انہیں شکست ہوئی اس کے بعد دوبارہ آزاد حیثیت سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑا اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ راجہ عامر زمان 2001-2005 تک ہری پور کے ضلعی ناظم منتخب۔[35] 2013 کے عام انتخابات میں آزاد حیثیت سے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے میدان میں آئے اور شکست ہوئی۔ پھر 2015 میں ہری پور کے ضمنی انتخاب میں قومی اسمبلی کے لیے پاکستان تحریک انصاف کے ٹکٹ سے میدان میں آئے اور مسلم لیگ ن کے بابر نواز سے شکست ہوئی۔

راجہ عامر زمان نے ضلع مری کے ایک بڑے گدی نشین کی بیٹی سے شادی کی، ان کے سسر کا نام پیر ہارون رشید ہے جن کے ہزاروں مرید ہیں اور علاقے میں بڑا اثر رسوخ ہے۔

راجہ فیصل زمان

راجہ سکندر زمان کے چھوٹے بیٹے اور راجہ عامر زمان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ راجہ فیصل زمان لگا تار تین دفعہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ جمعیت علمائے اسلام کے ٹکٹ سے منتخب ہوئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ ن میں شامل ہو گئے اب پارٹی کی طرف سے رکن صوبائی اسمبلی ہیں۔[36] راجہ فیصل کی شادی راجہ بشارت ملک کی بیٹی سے ہوئی ہے جو راجہ فیصل کی پھوپھی زاد ہیں۔[37]

تنقیدی جائزہ

اس میں شک نہیں پاکستان کی سیاست اور پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں پر ایسے لوگوں کا غلبہ ہے جو ہمارے طبقے سے نہیں ہیں۔ وہ یا تو جاگیردار ہیں یا سرمایہ دار ہیں اور پاکستان کے اداروں میں اعلی عہدوں پر فائض ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے بھی یہ لوگ ہمارے وسائل پر قابض تھے اور پاکستان بننے کے بعد بھی ہمارے حکمران یہی لوگ ہیں کیونکہ ان کے پاس سرمائے اور جاگیروں کی طاقت ہے، پاکستان بننے کے 70 سال بعد بھی ناانصافی اور ظلم کی بنیاد پر ان خاندانوں کا پاکستان کے اثاثوں اور زمین پر قبضہ قائم ہے۔

یہ قابض طبقہ اشرافیہ کے لفظ سے جانا جاتا ہے یعنی یہ وہ طبقہ ہے جو سرمایہ دار ہے یا جاگیردار ہے یا پھر حکومتی اداروں میں اعلیٰ عہدوں پر فائض ہے یعنی افسر شاہی کا حصہ ہے۔ برطانوی راج پر ایک مکالہ بیان کرتا ہے کہ برطانوی راج نے 1757-1857 کے عرصے میں مغلیہ دربار بالکل مٹا دیا اور اس زمانے کے شاہی خاندانوں کے تین چوتھائی حصے کو ختم کر دیا۔ اس کے علاوہ آدھے سے زیادہ مقامی زمینداروں کو بھی ختم کر دیا گیا اور ان کی جگہ ایک نئی بیوروکریسی قائم کی گئی جن کے ذوق یورپی تھے''۔[38]

اس مضمون میں ہری پور کے دو بڑے اور تاریخی خاندانوں کا ذکر کیا ہے جو یقیناً برطانوی راج کے طابعداروں اور وفاداروں میں سے تھے اور صلے میں بے پناہ وسائل اور اختیارات حاصل کیے۔ اگر ہم ان خاندانوں پر نظر ڈالیں جن کے پاس اثاثے اور جاگیریں مغلیہ دور یا اس سے بھی پہلے سے تھیں تو تب بھی یہ حقیقت نظر آئے گی کہ یہ وہ خاندان ہیں جنہوں نے ہمیشہ حکمران طبقہ کی خواہشات کو اول مانتے ہوئے ان کے ظلم کو سہارا دیا۔ ان کی رشتہ داریاں بھی بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار گھرانوں سے ہیں اور یہ لوگ پاکستان کی مختلف سیاسی جماعتوں میں بھی 70 سال گزر جانے کے باوجود موجود ہیں۔

چند خاندان جمہوریت اور کثیر آبادی پر قابض ہیں۔ موجودہ جمہوریت بھی انہی لوگوں کے لیے ہے اور یہی لوگ حکومت میں بیٹھ کر ہمارے مقدر کے فیصلے کرتے ہیں۔ جو محنت کر رہا ہے نہ بھر پیٹ روٹی کھا سکتا ہے نہ اپنے بچوں کو تعلیم دلوا سکتا ہے نہ علاج کروا سکتا نہ اس کے سر کے اوپر چھت ہے۔ جب تک ایسی جمہوریت ہوگی اور حکمران بھی ایسے ہوں گے جن کا زکر مندرجہ بالا کیا گیا ہے تو ہمارے ملک کی عوام کی زندگی کبھی آسان نہیں ہوسکتی۔ انہی حالات کی واضح شکل ہمارے ملک کے دیگر اعداد و شمار سے سمجھ آتے ہیں۔ 2015 میں پاکستان میں زچگی سے ہونے والی اموات میں پاکستان کا درجہ 147 سے گر کر 149 ہوگیا ہے۔[39] پاکستان میں خواندگی کی شرح بھی باقی ہمسایہ ممالک سے بہت کم ہے، نہ کہ یہ شرح بڑھے پچھلے سالوں سے کم ہے۔[40] خودکشیوں کی موجودہ لہر جو معاشی مصیبتوں کا نتیجہ ہے، اسی مالی بحران کا المناک ثبوت ہے جس میں عام شہری مایوس ہو کر اپنی زندگی ختم کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، ہم کیونکر مان لیں کہ موجودہ جمہوری طرز حکمرانی میں ہماری فلاح ہے؟

یہ اعداد و شمار گواہی دیتے ہیں کہ جہاں یہ اشرافیہ طبقہ ہر طرح سے آرام و آسائش میں زندگی گزارتا ہے، غریب صرف مٹنے کے لیے ہے۔ یہ جاگیردار اور سرمایہ دار عوام کو اختیارات کبھی نہیں دے سکیں گے کیونکہ ہم ان کے لیے نچلے درجے کے کم ذات ہیں اور ہمارے درمیان رشتے کبھی بھی انسانیت پر مبنی نہ تھے۔ ہری پور میں راجگان خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے یہ روایت بھی سامنے آئی کہ پہلے عام لوگ ان کے سامنے سیدھی چارپائی پر نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اچھا لباس پہن کر ان کے سامنے جاتا تو ان کو بہت برا لگتا تھا یعنی عام اشخاص کا اچھے کپڑے پہننا انہیں پسند نہیں تھا۔ ان حالات میں کیونکر یہ عوام کے لیے منصفانہ فیصلہ سازی کریں گے؟

اسی طرح اگر ہم ترین خاندان پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح ہے کہ ایوب خان نے اس ملک کی سیاسی آزادی پر سب سے پہلے ڈاکہ ڈالا اور آج یہ روش عام ہے۔ یقیناً یہ وہ خاندان ہیں جنہوں نے انگریز راج کے سکھائے ہوئے سبق کبھی نہ بھولے۔

ایوب خان کے خاندان میں اقربا پروری عروج پر تھی۔ بیٹوں کو اے ڈی سی بنانے کا مطلب کیا تھا؟ پوری پاکستانی فوج میں اور کوئی اس کام کے لیے اہل نہ تھا؟ یہی بیٹے جو اے ڈی سی بن کر آئے تھے بعد میں تعلیمی معیار پر پورا نہ اترنے کے باعث انتخابات میں حصہ نہ لے سکے پر اسی ملک کی دیگر وزارتوں کو سنبھالتے رہے۔ یہ کس قسم کی حکمت عملی ہے کہ اس قدر اہم عہدوں کو سنبھالنے کے لیے اس قدر کم تعلیم والے سیاسی نمائندے کیوں رکھے جاتے ہیں؟ اگر یہی عہدہ کسی کسان یا مزدور کو دیا جائے تو کہا جائے گا کہ وہ ان پڑھ ہے۔ حکومت کیسے چلائے گا؟

یہ خاندان نسل ذات سب کچھ بالائے طاق رکھ کر اپنے طبقہ میں شادیاں کرتے ہیں، اپنے خاندانوں کی مالی اور سیاسی طاقت کو مضبوط سے مضبوط کرتے جاتے ہیں لیکن عوام کو کبھی نسل کی بنیاد پر، کبھی زبان پر اور کبھی مذہبی رجحانیت پر ایک دوسرے سے لڑواتے ہیں۔ یہی تو وہ گر ہیں جو انگریز ان کو سکھا کر گیا۔

بظاہر منتخب ارکان لوگوں کے اصلی نمائندے ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ الیکشن کے دنوں میں عام آدمی کی جلسے جلوسوں میں شمولیت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ بات اور ہے کہ یہ شراکت اور شمولیت دراصل مقامی سیاست دانوں کے ساتھ معاہدہ ہوتا ہے جس کے تحت انہیں آمد و رفت کی سہولت، کھانا وغیرہ اور بعض اوقات نقد روپیہ بھی دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نمائندگی محض دکھاوا ہے اور سیاسی عمل شمولیتی اور شراکتی نہیں ہے۔ رسمی سیاسی عمل ہر سطح پر خواہ وہ یونین کونسل ہو، صوبائی اسمبلی ہو یا قومی اسمبلی حقیقتاً عدم شمولیت پر مبنی ہے جس نے موجودہ سماجی و اقتصادی بحران جنم دیا ہے اور ملک کے قدرتی اور انسانی وسائل بڑے منظم طریقے سے لوٹے ہیں۔ موجودہ سیاسی نظام نے ریاست، قومی اور بین الاقوامی اداروں کی دولت اور طاقت کے حصول کی کشمکش میں قدرت، معاشی ترقی اور خود انسانی زندگی کا توازن بگاڑ دیا ہے۔

جمہوریت کے اس کھیل کو دیکھتے ہوئے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ طرز جمہوریت سرمایہ داری ایجنڈے کا نعرہ ہے اور اسی کی وجہ سے کم از کم طاقتور طبقے کو یقیناً قائم رکھا جائیگا تاکہ مزدور طبقے تک نہ وسائل پہنچ سکیں اور نا ہی دولت اور زمین کا بٹوارا ممکن ہو۔ جیسے جیسے ٹیکنالوجی اور جنگی سازو سامان میں جدت آ رہی ہے یقیناً وسائل پر قبضہ انگریز جابر حکومتیں رکھیں گی اور ہمارا حکمران طبقہ ان کا بھرپور ساتھ دے گا۔

> ## فرنگی کا جو میں دربان ہوتا
>
> فرنگی کا جو میں دربان ہوتا — تو جینا کس قدر آسان ہوتا
>
> فرنگی کا جو میں دربان ہوتا — تو جینا کس قدر آسان ہوتا
>
> میرے بچے بھی امریکہ پڑھتے — میں ہر گرمی میں انگلستان ہوتا
>
> میری انگلش بھی بلا کی چست ہوتی — بلا سے جو نہ میں اردو دان ہوتا
>
> سر جھکا کے جو ہو جاتا ''سر'' میں — تو لیڈر بھی عظیم الشان ہوتا
>
> زمینیں میری ہر صوبے میں ہوتیں — مِکیں واللہ صدر پاکستان ہوتا
>
> حبیب جالب

پاکستان کے معاشی و سیاسی حالات میں تبدیلی نو آبادیاتی نظام کے انتظامی ڈھانچے کے خاتمے سے مشروط ہے، اس ملک کی زمین کا منصفانہ اور مساویانہ بٹوارہ ہو اور زمین کسانوں کی ملکیت قرار دی جائے۔ ملک میں اکثریتی طبقے کو سیاسی بالادستی حاصل ہوا اور فیصلہ سازی میں اس کا اختیار ہو نیز ملکی وسائل پر بھی اسی طبقے کا اختیار ہو جو اس ملک کے کسان ہیں، اس ملک کے مزدور ہیں۔ جب ایسا ہو گا تو تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی حقیقی جمہوریت ہے۔ ہم اس جمہوریت کو مانتے ہیں جس سے انسانوں کے بیچ نفرت، مذہبی اور لسانی تقسیم نہ ہو درجہ جات نہ ہوں بلکہ سب انسان ایک ہی مقام پر کھڑے ہو کر اتفاق رائے سے اپنی مرضی سے اپنی فلاح کے فیصلے کر سکیں، اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔ تاریخ نے ثابت کر کے دیا ہے کہ ظلم کی کئی چٹانوں کو عوام نے سالوں بلکہ صدیوں کی جدوجہد سے چکنا چور کیا ہے۔ ظلم کی ایک تہہ کو ختم کیا ہے تو دوسری تہہ سامنے آئی ہے۔ پہلے مزدور غلام تھا پھر وڈیروں کا ہاری تھا اور اب مزدور ہے۔ آگے جدوجہد کئی صدیوں پر ہو پھر بھی یہ آخر کو رنگ لائے گی، وہ افق ہوگا کہ جب باوقار بااختیار مزدور و کسان ملکی باگ دوڑ سنبھالیں گے اور فیصلے انسانیت پر مبنی ہوں گے۔ ایک وقت آئے گا ایسا ضرور ہوگا۔!

حوالہ جات

1. Leonard, Thomas, M. "Encyclopedia of the Developing World, Volume 1-3, Index A-Z." Routledge, 2006. Accessed from https://books.google.com.pk/books?id=gc2NAQAAQBAJ&pg=PA125&lpg=PA125&dq=Hodson%27s+horses+mir+dad+khan&source=bl&ots=CLSWeWKgrp&sig=Z0shBmoGw1FCxrcQnbCLg5lYmJU&hl=en&sa=X&redir_esc=y#v=onepage&q=Hodson's%20horses%20mir%20dad%

20۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، صفحہ 59۔
21. Ref a. The News. "Will PTI's Amir Zaman or PML-N's Babar Nawaz herald a 'change'?" The News International, August 16, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/print/14117-will-ptis-amir-zaman-or-pml-ns-babar-nawaz-herald-a-change
22. Ahmad, Mahwish. "Same old new Pakistan." The DAWN, May 9, 2013. Accessed from http://www.dawn.com/news/812801/same-old-new-pakistan
23۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، صفحہ 59۔
24۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، صفحہ 88-89۔
25. Singh, Khuswant. "A History of the Sikhs, Volume 2:1839-2004." Oxford University Press, 1999. Accessed from https://archive.org/stream/AHistoryOfTheSikhs-Volume21839-2004/AHistoryOfTheSikhs-Volume21839-2004_djvu.txt
26. Ibid.
27۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، صفحہ 89۔
28۔ ایضاً، صفحہ 429۔
29. Masey, Charles Francis. "Chiefs and families of note in the Delhi, Jalandhar, Peshawar and Derajat divisions of the Panjab." Allahbad, Pioneer Press, 1890, P 429. Accessed from https://archive.org/stream/chiefsfamiliesof00massrich/chiefsfamiliesof00massrich_djvu.txt
30. Ibid, p. 429-30.
31. World Heritage Encylopedia. " Raja Sikander Zaman." World Heritage Encyclopedia. Accessed from http://www.gutenberg.us/articles/raja_sikander_zaman
32۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، صفحہ 89۔
33۔ ایضاً صفحہ 90-92۔
34. DAWN. "Former CM passes away." DAWN, March 17, 2007. Accessed from http://www.dawn.com/news/237811/former-cm-passes-away
35. The News. "Will PTI's Amir Zaman or PML-N's Babar Nawaz herald a 'change'?" The News International, August 16, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/print/14117-will-ptis-amir-zaman-or-pml-ns-babar-nawaz-herald-a-change
36. Sadaqat, Muhammad. "Its show time: Half a million electorates decide face of NA-19, Haripur today." The Express Tribune, August 16, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/938817/its-showtime-half-a-million-electorates-decide-fate-of-na-19-haripur-today/
37۔ ایضاً صفحہ 92۔
38. 50 Maddison, Angus. "The economic and social impact of colonial rule in India," in "Class structure and economic growth: India and Pakistan since the Moghuls." George Allen and Unwin, 1977. Accessed from http://www.ggdc.net/maddison/articles/moghul_3.pdf,
39. Junaidi, Ikram. "Pakistan's ranking in mother mortality rate falls futher." Daily DAWN, May 6, 2015. Accessed from http://www.dawn.com/news/1180278
40. Haq, Riazul. "Education woes: Pakistan misses UN target with 58% literacy rate." The Express Tribune, June 5, 2015. Accessed from http://tribune.com.pk/story/897995/education-woes-pakistan-misses-un-target-with-58-literacy-rate/

20khan&f=false
2. Cresse, Michael, J. "'Swords trembling in their scabbards': a study of Indian officers in the Indian cavalry, 1858-1918." Universtiy of Leicester, 2007. Accessed from https://lra.le.ac.uk/handle/2381/8635
3۔ عقیل عباس جعفری، پاکستان کے سیاسی وڈیرے، صفحہ 32۔
4. Barua, Pradeep. "Gentlemen of the Raj: the Indian army officer corps, 1817-1949." Praeger Publishers, 2004. Accessed from https://books.google.com.pk/books?id=-U8IUoC_tP0C&pg=PA51&lpg=PA51&dq=Risaldar+Mir+Dad+Khan&source=bl&ots=LQawuxUHD_&sig=BmU1QIDgt6Wr659WOuQ-nCHQWJE&hl=en&sa=X&ved=0ahUKEwjMg9KV_57MAhUEE5QKHUInCAc4ChDoAQgYMAA#v=twopage&q=Risaldar%20Mir%20Dad%20Khan&f=false
5. Ibid, p. 52.
6. Encyclopeida Brittanica. "Mohammad Ayub Khan: president of Pakistan." Encyclopeida Brittanica, Inc., 2016. Accessed from http://www.britannica.com/biography/Mohammad-Ayub-Khan
7. URDU Jaffari. P. 42.
8. Ibid
9. Bibojee Group of Companies. "Welcome to Bibojee Group of Companies." Bibojee Group of Companies, 2011. Accessed from http://www.bibojee.com.pk
10. Gustafan, Eric. "Economic reforms under the Bhutto regime," in Korsen, J. Henry. "Contemporary problems of Pakistan." Leiden E. J. Brill, 1974. Accessed from https://books.google.com.pk/books?id=p5c3AAAAIAAJ&pg=PA82&lpg=PA82&dq=1972+pakistan+nationalization+gandhara+gohar+ayub+bhutto+managing+agent&source=bl&ots8dde6XABhh&sig=3uLR2aQ9FvNiIBlzwD4ucFk95SU&hl=en&sa=X&redir_esc=y#v=onepage&q=1972%20pakistan%20nationalization%20gandhara%20gohar%20ayub%20bhutto%20managing%20agent&f=false
11. Ghumman, Khawar. "Arithmetic of political families in national, provincial assemblies." DAWN, December 20, 2002. Accessed from http://www.dawn.com/news/73823/arithmetic-of-political-families-in-national-provincial-assemblies
12. The Wall Street Journal. "Bannu Woollen Mills Limited." March 1, 2016. Dow Jones Company, 2016. Accessed from http://quotes.wsj.com/PK/XKAR/BNWM/company-people
13. 4-traders. Business leaders: Zeb Gohar Ayub Khan." People and Ownership, 2016. Accessed from http://www.4-traders.com/business-leaders/Zeb-Khan-09K3T9-E/biography/
14. Saif Group. "Executive management." Saif Group. Accessed from http://www.saifgroup.com/executive.php
15. Muhammad, Riaz. "Saifullahs - politics of business." Khyber Gateway, Septermber 16, 2005. Accessed from http://www.khyber.org/people/a/Saifullahs_-_Politics_of_Busin.shtml
16. Khan, Omar Ayub. "Form XXI: Statement of assets and liabilities." Omar Ayub Khan, Haripur District, NA 19. June 30, 2014. Annexure III.
17. The News. "Gohar Ayub's wife passes away." The News, December 19, 2015. Accessed from http://www.thenews.com.pk/print/82869-Gohar-Ayubs-wife-passes-away
18. Universal Insurance Company Limited. "Annual Report, 2013." Accessed from http://uic.com.pk/reports/2013/anual-reports-2013.pdf
19. Khan, Omar Ayub. "Form XXI: Statement of assets and liabilities." Omar Ayub Khan, Haripur District, NA 19. June 30, 2014, p. 2.

پاکستان کا آبپاشی نظام: اصلاحات یا نجکاری

تحریر: جنید احمد

پاکستان میں پانی کے حوالے سے زیر نظر مضمون میں ملک میں قائم وسیع آبپاشی نظام کے انتظامی ڈھانچے میں مختلف ادوار میں کی جانے والی بنیادی اصلاحات، اس کی وجوہات، مقاصد اور ضروریات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دستیاب معلومات کی بنیاد پر ان اصلاحات کا تنقیدی جائزہ قارئین کے پیش نظر ہے۔

پاکستان کا شمار نیم بارانی خطے میں ہوتا ہے جہاں اوسط 240 ملی میٹر سالانہ سے کم بارش ہوتی ہے۔ ملکی معیشت زراعت پر انحصار کرتی ہے جس کے لیے پانی کی ضروریات ہمالیہ اور ہندوکش میں برفانی پہاڑوں سے جاری ہونے والے دریائی نظام پر ہے۔[1]

انڈس بیسن

ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے پر 1.12 ملین مربع کلومیٹر پر پھیلا انڈس ریور بیسن 47 فیصد پاکستان، 39 فیصد بھارت، 8 فیصد چین اور 6 فیصد افغانستان میں ہے۔[2] انڈس بیسن سے ہی بہہ کر آنے والے دریائے جہلم، چناب، راوی اور ستلج بھارتی حدود سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں اور پنجاب میں پنجند کے مقام پر گلگت بلتستان اور خیبر پختون خواہ کے مختلف علاقوں سے بہہ کر آنے والے دریائے سندھ سے مل جاتے ہیں۔ افغانستان کی حدود سے بہہ کر آنے والا دریائے کابل بھی چشمہ کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہوجاتا ہے۔ گڈو بیراج سے یہ دریا سندھ میں داخل ہوکر تقریباً 3200 کلومیٹر فاصلہ طے کر کے بحیرہ عرب میں جا گرتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دریائے سندھ کا سالانہ بہاؤ 207 بلین مربع میٹر ہے۔[3]

واٹر اینڈ پاور ڈیولپمنٹ اتھارٹی[4]

واٹر اینڈ پاور ڈیولپمنٹ اتھارٹی (Water and Power Development Authority/ WAPDA) وفاقی حکومت کے زیر انتظام ایک خود مختار آئینی ادارہ ہے جسے 1954 میں قائم کیا گیا۔ WAPDA (واپڈا) ملک بھر میں پانی اور پن بجلی کے وسائل کو موثر طریقے سے ترقی دینے، نئے آبی ذخائر کی تعمیر و ترقی پہلے سے موجود ڈھانچے کی توسیع و مرمت اور پن بجلی کی پیداوار کا ذمہ دار ہے۔

آبپاشی نظام

انڈس ریور سسٹم پر دنیا کا وسیع منظم آبپاشی نظام قائم ہے جو شمالی علاقوں سے زیریں سندھ تک 0.6 ملین مربع کلومیٹر علاقے پر مشتمل ہے اور 42 ملین ایکڑ اراضی کو سیراب کرتا ہے۔[5] اس آبپاشی نظام میں 44 کنال سسٹم ہیں جن کی لمبائی 56,000 کلومیٹر ہے اور تقریباً 107,000 واٹر کورسوں (کھالوں) کی لمبائی 1.6 ملین کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ مرکزی کنالوں میں پانی بیراجوں اور دریا سے نکلنے والی 12 (انٹر لنک) کنالوں کے ذریعے موڑا جاتا ہے۔[6]

آبپاشی نظام میں کی گئی اصلاحات

1960 میں عالمی بینک کی ثالثی میں سندھ طاس معاہدے کے بعد سے اس آبپاشی نظام میں تعمیر و ترقی کا آغاز ہوا۔ دریائے سندھ پر تربیلا ڈیم کی تعمیر بھی اسی عشرے میں عالمی بینک کے سرمائے سے 1964 میں شروع ہوئی۔[7] دو بنیادی وجوہات کی بنا پر اس نظام میں اصلاحات کا عمل شروع کیا گیا تھا۔ ایک زرعی پیداوار میں اضافہ اور دوسرا آبپاشی نظام میں انتظامی اصلاحات کر کے پانی کو ضائع ہونے سے بچانا۔

زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے زیر کاشت رقبے میں اضافہ ضروری تھا جس کے لیے یقیناً پانی کی متواتر دستیابی بھی ضروری تھی۔ اس مقصد کے لیے نہری

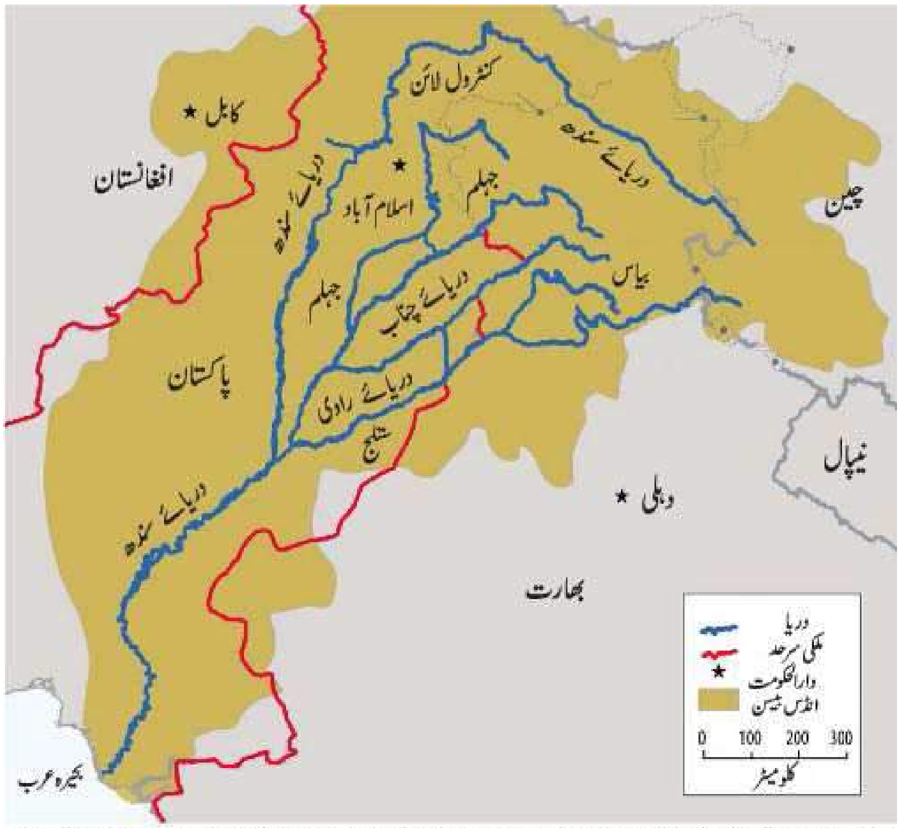

http://defence.pk/threads/pakistan-middle-class-bigger-wealthier-than-indian-middle-class.403608/page-7

نظام کی بہتری اور انتظامی امور میں اصلاحات کے لیے امریکی امدادی ادارہ برائے بین الاقوامی ترقی (United States Aid for International Development/USAID)، عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک نے مختلف ادوار میں پاکستان میں ترقیاتی منصوبے مکمل کیے جس کا مقصد آبپاشی نظام میں ضائع ہونے والے پانی کو بچانا اور کنال کی سطح سے نیچے کھالوں کی سطح تک نہری نظام کسانوں کو منتقل کرنا تھا۔ اس حوالے سے کچھ منصوبوں کی دستیاب معلومات پیش نظر ہیں۔

1968 میں USAID (یو ایس ایڈ) کی مالی مدد سے پانی کے انتظام پر تحقیقی منصوبہ (واٹر مینجمنٹ ریسرچ پروجیکٹ) شروع کیا گیا جس میں امریکہ کی کالیراڈو اسٹیٹ یونیورسٹی نے پاکستان کو تکنیکی اور تحقیقی مدد فراہم کی تا کہ اس بڑے نہری نظام سے سیراب ہونے والی زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔ یونیورسٹی کے تحقیق کے ماہر ڈاکٹر گلبرٹ کورے نے پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد اپنی رپورٹ میں لکھا کہ

"ایک ہزار میل لمبی بنیادی کنال، چالیس ہزار میل لمبی چھوٹی کنالیں اور ایک ملین میل سے بھی زیادہ طویل کھالیں دریائی پانی کو کھیتوں تک پہنچاتی ہیں اور بقیہ زمینوں پر ٹیوب ویل کے ذریعے پانی حاصل کیا جاتا ہے۔ قدرت نے یہاں انتہائی موافق موسم دیا ہے جس کی وجہ سے یہاں بڑے پیمانے پر زرعی پیداوار کے امکانات ہیں۔ زیادہ تر زمینوں پر سال میں دو بار فصل حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس بات پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ یہ وسیع آبپاشی نظام عالمی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ یہاں غذائی پیداوار پاکستان کی موجودہ آبادی سے کئی گنا زیادہ آبادی کو خوراک فراہم کرسکتی ہے"۔[8]

اس تحقیقی منصوبے کے تحت ہی پہلی غیر سرکاری واٹر یوزرز ایسوی ایشن (پانی استعمال کرنے والوں کی تنظیم) قائم کی گئی اور آزمائشی طور پر کھالوں کی مرمت اور انہیں پکا کرنے کا کام شروع ہوا۔ پانی ضائع ہونے کی وجوہات اور اس کے حل پر تحقیق کی گئی جس کی بنیاد پر اگلے منصوبے ترتیب دیے گئے۔

زمین ہموار کرنے کا منصوبہ (Precision Land Levelling Project)[9]

زمین ہموار کرنے کے منصوبے کے لیے یو ایس ایڈ نے مالی اور تکنیکی امداد فراہم کی اور کسانوں کو ٹریکٹر آسان شرائط پر فراہم کیے گئے تا کہ وہ زمین کو ہموار کرسکیں۔ منصوبہ سندھ اور پنجاب میں شروع ہوا اور ایک سال بعد خیبر پختون خواہ تک بڑھا دیا گیا۔ یہ منصوبہ 1974 سے 1976 تک جاری رہا۔

یو ایس ایڈ کا آن فارم واٹر مینجمنٹ پائلٹ پرجیکٹ[10]

یو ایس ایڈ کی طرف سے فراہم کیے جانے والے 7.5 ملین ڈالرز کے امدادی قرضے سے 1976 میں پنج سالہ آن فارم واٹر مینجمنٹ یعنی کھیت کی سطح پر پانی کے انتظام کا آزمائشی منصوبہ شروع کیا گیا جس کا مقصد تھا کھالوں کی ازسرنو تعمیر، دس فیصد کھالوں کو پختہ کرنا، زمین کو ہموار کرنے کے لیے مشینری کے استعمال کو پچاس فیصد زرتلافی دے کر فروغ دینا، پانی کے انتظامی معاملات کی تربیت کے لیے ادارے کا قیام اور کسانوں کو واٹر یوزرز ایسوی ایشن کی صورت منظم کرنا۔

واٹر یوزرز ایسوی ایشنز آرڈیننس[11]

1980 میں آن فارم واٹر مینجمنٹ پائلٹ پروجیکٹ کے اختتام پر 1981 میں پاکستان کے تین صوبوں (سرحد، پنجاب اور بلوچستان) نے واٹر یوزرز آرگنائزیشنز آرڈیننس نافذ کیا جبکہ سندھ نے یہ آرڈیننس 1982 میں نافذ کیا۔ آرڈیننس کے مطابق پانی استعمال کرنے والے پچاس فیصد کسان جمع ہوکر آسکتے تھے اور آن فارم واٹر مینجمنٹ کے دفتر میں اپنی تنظیم کا اندراج کرواسکتے تھے۔ تنظیم کو کھالوں کو بہتر بنانے، چلانے، مرمت کے لیے افرادی قوت کا بندوبست کرنے، پانی چھوڑنے کے اوقات، اس کی مقدار اور اس کی تقسیم کے اختیارات تھے۔

آن فارم واٹر مینجمنٹ۔ [12]

1981 ہی میں آزمائشی منصوبے کی کامیابی کی صورت میں منصوبے میں یو ایس ایڈ کے ساتھ ساتھ عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک بھی مدد کے لیے شامل ہوگئے۔ کھالوں کی ترقی و تعمیر اور ساتھ ساتھ واٹر یوزرز ایسوی ایشن کا قیام پورے ملک تک پھیلا دیا گیا جو پہلے آزمائشی منصوبہ ہونے کی وجہ سے محدود تھا۔ عالمی بینک اور ایشیائی ترقیاتی بینک سے قرض اور تکنیکی مدد ملنے کے بعد کھالوں کی مرمت کے لیے مطلوبہ مشینری اور تعمیری ساز وسامان صوبائی حکومت کو مل گیا۔ آن فارم واٹر مینجمنٹ۔II کے نام سے منصوبے کو مزید تین سال کی توسیع دی گئی جس کے بعد اس کی مدت 1987 تک بڑھ گئی۔ دونوں بینکوں کی طرف سے منصوبے کے لیے فراہم کیے گئے قرض یا امداد کی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔

صوبوں کے زیر انتظام آبپاشی نظام میں عالمی امدادی اداروں کے فراہم کردہ قرض سے جاری منصوبے تحقیق سے شروع ہوکر واٹر یوزرز ایسوی ایشنز کے قیام تک جاری رہے۔ آن فارم واٹر مینجمنٹ منصوبے کے تحت قائم کی گئی ایسوی ایشنز کے نمونے (ماڈل) میں نمایاں تبدیلی 1992 میں انڈس ریور سسٹم اتھارٹی کے قیام کے بعد 1997 میں نظر آتی ہے جب صوبوں میں اریگیشن اینڈ ڈرینج (آبپاشی اور نکاسی) اتھارٹیوں کا ایک ساتھ قیام عمل میں آیا۔[13] اس پورے انتظامی ڈھانچے کی تفصیلات اور مقاصد جاننے کے بعد گزشتہ نظام کے مقابلے میں ہونے والی تبدیلی کو سمجھا جاسکتا ہے۔ چونکہ نہری نظام کا زیادہ تر حصہ صوبہ پنجاب اور سندھ میں واقع ہے اسی مناسبت سے ان دونوں صوبوں کی اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی کی تفصیلات رقم کی جارہی ہیں۔

انڈس ریور سسٹم اتھارٹی[14]

انڈس ریور سسٹم اتھارٹی (Indus River System Authority/ IRSA) صوبوں کے درمیان 1991 میں مشترکہ مفادات کونسل میں ہونے والے پانی کی تقسیم کے معاہدے کے بعد قائم کی گئی۔صوبوں کے درمیان اس سے پہلے پانی کی تقسیم عارضی بنیادوں پر خریف اور ربیع کی فصلوں کے لیے ہوتی تھی جس پر اکثر صوبوں کے درمیان تنازعہ پیدا ہوتا تھا۔ IRSA (ارسا) صوبوں کے درمیان ہونے والے معاہدے کے تحت ملکی آبی وسائل کی صوبوں کے درمیان منصفانہ تقسیم،نگرانی اور انتظام کا مجاز ہے۔ ملک میں پانی کی دستیابی، بہاؤ اور اس کی ضروریات کے اعداد و شمار بھی ارسا ہی جاری کرتی ہے۔ اس کے علاوہ صوبوں کے درمیان آبی تنازعات کو حل کرنا بھی اسی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ یہ اتھارٹی چاروں صوبوں اور وفاق کے ایک ایک نمائندے مشتمل ہوتی ہے۔ اس ادارے کے قیام کے بعد صوبوں کو ملنے والے پانی کی مقدار پر غیر یقینی کیفیت اور تنازعات بھی ختم ہوگئے۔

پنجاب اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی[15]

پنجاب اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی (Punjab Irrigation and Drainage Authority/ PIDA) ایکٹ 1997 کے تحت قائم کی گئی جس کا مقصد آبپاشی نظام میں اصلاحات کرکے موجودہ انتظامی ڈھانچے کو ایک موثر، جامع اور شفاف نظام سے تبدیل کرنے کے لیے ہر کنال پر ایریا واٹر بورڈ اور کنال سے نکلنے والی نہروں اور کھالوں کی سطح پر کسان تنظیموں کا قیام تھا۔

PIDA (پیڈا) کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔

- پیڈا کو پانی کی ترسیل، نکاسی اس کی مرمت اور انتظامی معاملات پر آنے والی لاگت کے حوالے سے خود انحصار بنانا یعنی ادارے میں اپنے تمام اخراجات خود برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- نکاسی، آبیانہ/ پانی پر عائد ٹیکس کی وصولی کی جانچ اور اسے بہتر کرنے کے لیے اقدامات کرنا۔
- انتظامی اور مرمتی اخراجات کم کرنا اور مرمت کے لیے منصوبہ بندی میں اضافہ کرنا۔
- ایریا واٹر بورڈ اور کسان تنظیموں کے ذریعے مشترکہ انتظام کے نظریے کو متعارف کرانا اور ایسی پالیسی اپنانا اور نافذ کرنا جس سے کسان تنظیمیں پروان چڑھیں اور ان کی کارکردگی کی جانچ ہوسکے۔
- اپنی حدود میں سیلاب سے بچاؤ، پانی کی ترسیل اور نکاسی کے ڈھانچے کی منصوبہ بندی،تعمیر، مرمت اور اسے چلانا۔

سندھ اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی[16]

سندھ اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی (Sindh Irrigation and Drainage Authority/ SIDA) خودمختار ادارہ ہے جو سندھ کے آبپاشی و بجلی کے محکمے سے آبپاشی

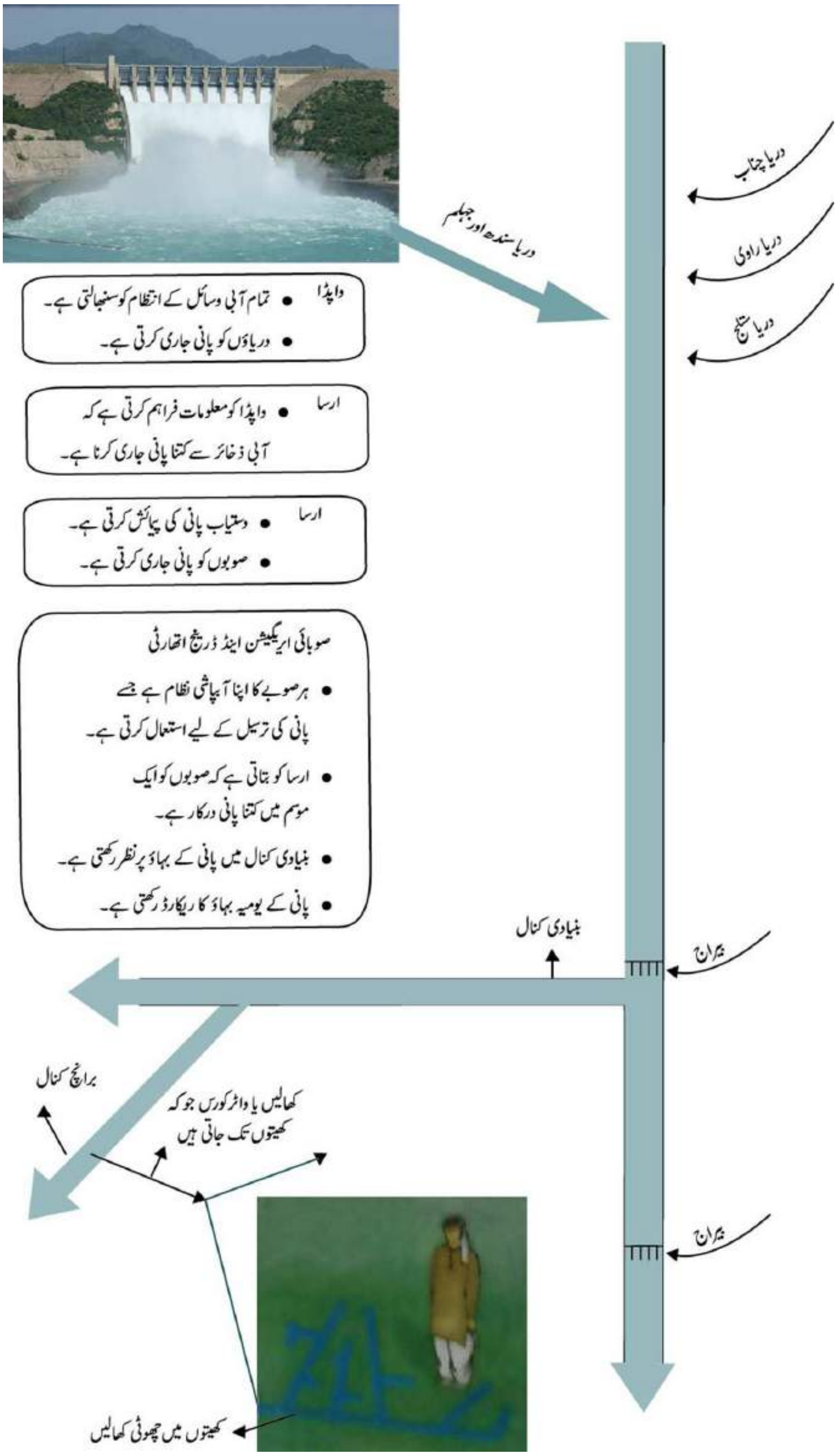

اور نکاسی کے نظام کی منتقلی میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ ادارہ بھی 1997 میں قائم کیا گیا۔ اس کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے:

- بیراج سے کنالوں کو پانی فراہم کرنا ہے جن کا انتظام ایریا واٹر بورڈ کے ذریعے چلایا جائے گا۔
- ایریا واٹر بورڈ اور پانی کے دیگر صارفین پر آبیانہ یا محصول عائد کرنا۔
- آبپاشی، نکاسی اور سیلاب سے بچاؤ کے ڈھانچے کے انتظامی امور، اس کی تعمیر، اور مرمت کرنا شامل ہے۔

ایریا واٹر بورڈ[17]

پیڈا اور سیڈا کے ماتحت ایریا واٹر بورڈ قائم کیے گئے ہیں جو اپنی حدود میں بیراج سے نکلنے والی کنال، بنیادی کنال اور برانچ کنال کی سطح پر آبپاشی اور نکاسی نظام چلانے اور اس کی مرمت پر آنے والے اخراجات کے ذمہ دار ہیں۔ دونوں ادارے اپنے مقاصد کی تکمیل کی طرف گامزن ہیں اور ایریا واٹر بورڈ اور اس سے تقسیم ہونے والی نہروں پر کسان تنظیموں کا قیام اب بھی جاری ہے۔

کسان تنظیمیں[18]

کسان تنظیمیں ایریا واٹر بورڈ کے ماتحت کام کرتی ہیں جنہیں واٹر کورس اور کھالوں کا انتظام منتقل کیا جارہا ہے۔ یہ تنظیمیں اپنے علاقوں میں آبپاشی نظام کے ڈھانچے کے انتظامی اور مرمت کے کاموں کی ذمہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ کسانوں سے آبیانہ وصول کرکے اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی کو جمع کرانے کی بھی ذمہ دار ہیں۔ یہ کسان تنظیمیں پانی کی چوری روکنے، اس کی منصفانہ فراہمی اور علاقے میں کسانوں کے درمیان پانی کے تنازعے کو بھی حل کرتی ہیں۔ پنجاب کے 17 میں سے پانچ ایریا واٹر بورڈ میں کسان تنظیمیں قائم ہوچکی ہیں، باقی میں تنظیم سازی جاری ہے جبکہ سندھ میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

پانی کی کمی

آبپاشی نظام میں اس وقت جاری انتظامی اصلاحات کی بنیادی وجہ جو بیان کی جاتی ہے وہ پانی کی قلت ہے جو زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ سمجھی جاتی ہے۔ پاکستان پانی کی کمی کے شکار ممالک میں شامل ہوچکا ہے اس حوالے سے عالمی اداروں کی رپورٹ ملاحظہ ہو جس میں پانی کی قلت، اس کی وجوہات، پانی کی کمی سے نمٹنے اور زرعی پیداوار میں اضافے کے لیے تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں۔

عالمی بینک کی رپورٹ

مارچ 1994 میں عالمی بینک کی جاری کردہ رپورٹ میں پاکستان کے جن آبپاشی مسائل کی نشاندہی کی گئی ان کے مطابق پاکستان کا آبپاشی اور نکاسی کا نظام مرمت نہ ہونے اور اپنی استعداد سے بڑھ کر استعمال کی وجہ سے بگڑتا جارہا ہے۔ آبیانہ یا پانی فراہم کرنے کی قیمت انتظامی اور مرمتی اخراجات کے مطابق نہیں ہے۔ صوبائی محکمہ آبیانہ وصول کرتا ہے اور اسے صوبائی آمدنی ہی تصور کرتا ہے جبکہ وصول کردہ قیمت آبپاشی نظام پر آنے والے اخراجات کے مقابلے میں صرف 44 فیصد ہے۔ بینک اس مسئلے کی وجوہات کے متعلق کہتا ہے کہ

''دیگر کچھ ممالک کی طرح پاکستان میں حکومت زراعت کے لیے پانی کو عوامی جنس سمجھتی ہے جبکہ یہ نجی تجارتی جنس ہے جسے منڈی کی بنیاد پر چلایا جاسکتا ہے۔ مناسب نجی ملکیتی حقوق نہ ہونا اور پانی کی غیر قانونی فروخت زرعی پانی کی منڈی کو غیر رسمی رہنے پر مجبور کررہی ہے۔ بجائے اس کے کہ منڈی کے لیے ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے آبپاشی نظام کو حکومتی سطح پر چلایا جارہا ہے، آبیانے کی وصولی ناکافی ہے اور پانی کے وسائل غلط طریقے سے فراہم کیے جارہے ہیں''۔[19]

عالمی بینک ہی اپنی 2005 کی ایک اور رپورٹ میں کہتا ہے کہ ''بینک پاکستان میں ایسے آبپاشی نظام کی ترقی پر زور دیتا ہے جس میں سماجی انجمنوں، چھوٹے اور بڑے پیمانے پر نجی شعبے کی شراکت اور دیگر نئے شراکت داروں کی شمولیت ہو اور ایسے معاہدوں کا استعمال ہو جس میں پانی کے ترسیل کنندگان اور استعمال کنندگان کے حقوق اور ذمہ داریوں اور پانی کی فراہمی کے معیار مقرر کیے گئے ہوں''۔[20]

انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کی رپورٹ

انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (International Monetary Fund/ IMF) کی چند ماہ پہلے جاری کردہ رپورٹ کے مطابق پاکستان پانی کی کمی کے شکار 36 ممالک میں شامل ہے۔ 1951 میں پانی کی دستیابی فی کس 5,600 مربع میٹر تھی جو کم ہو کر 1,017 مربع میٹر فی کس ہوگئی ہے۔ آبادی کے تناسب سے پانی کی طلب بڑھتی جارہی ہے جو 2025 تک 274 ملین ایکڑ فٹ تک بڑھ جانے کا امکان ہے جبکہ دستیاب پانی 191 ملین ایکڑ فٹ رہے گا جس کے نتیجے میں طلب اور رسد میں 83 ملین ایکڑ فٹ کا فرق ہوگا۔ پاکستان میں موجودہ ڈیم کی پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش صرف 30 دن کی ہے جو بھارت کے پاس 220 دن اور مصر کے پاس 1,000 دن ہے۔

IMF (آئی ایم ایف) کا اپنی رپورٹ میں کہنا ہے کہ زراعت میں اور شہروں میں پانی کے پائیدار استعمال کو یقینی بنانے کے لیے اصلاحات اہم ہیں۔ آبپاشی نظام کی ذریعے فراہم کیے جانے والے پانی کی قیمت اس پر آنے والی لاگت کے مقابلے انتہائی کم ہے جس کی وجہ مالی طور پر غیر پائیدار آبپاشی نظام ہے۔ آبیانہ کی وصولی آبپاشی نظام پر سالانہ آنے والی لاگت اور مرمت کے مقابلے میں صرف 24 فیصد ہے جبکہ آبیانے کے واجبات کی وصولی 60 فیصد ہے جس کی وجہ سے حکومتی بجٹ اخراجات کی مد میں خرچ ہورہا ہے۔ اس کے علاوہ تمام اقسام کی فصلوں کے لیے آبیانے کی شرح یکساں ہے یہاں تک کے چاول کی فصل پر بھی جس میں کپاس کے

مقابلے 60 فیصد زیادہ پانی استعمال ہوتا ہے۔ آبپاشی نظام میں پانی کے زیادہ استعمال سے 36 فیصد زیر زمین پانی نہایت کھارا ہوگیا ہے۔ یہی صورتحال شہروں میں پینے کے پانی کی ہے۔ گھروں میں استعمال ہونے والے پانی کی قیمت انتہائی کم ہے جس میں کئی سالوں سے اضافہ نہیں کیا گیا۔ پاکستان کا آبپاشی نظام تاریخی طور پر زرعی ضروریات کے لیے بنایا گیا تھا لیکن شہری آبادی اور صنعتوں میں اضافے کی وجہ سے یہاں پینے کے صاف پانی اور نکاسی کے لیے ضروری ڈھانچے کی تعمیر کے لیے سرمایہ کاری کی ضرورت ہوگی۔[21]

پاکستان میں پانی کی کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے پیداوار میں اضافے کے لیے صوبائی حکومتیں بڑی تیزی سے آبپاشی نظام میں اصلاحات کررہی ہیں جس کے لیے قرض دینے والے ادارے خصوصاً عالمی بینک اربوں روپے فراہم کررہے ہیں۔ 2007 سے 2015 کے دوران شروع ہونے والے کچھ منصوبے کئی شعبہ جات سے جڑے ہیں جن میں سندھ اور پنجاب میں زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے بیراجوں اور دیگر آبی شعبوں میں بہتری شامل ہے۔ ان منصوبوں کے نام اور حاصل کردہ قرض مندرجہ ذیل ہیں۔[22]

سندھ اریگیٹڈ ایگری کلچر پروڈکٹوٹی انہانسمنٹ پروجیکٹ: 187 ملین ڈالرز
سندھ بیراج امپرومنٹ پروجیکٹ: 188 ملین ڈالرز
سندھ واٹرسیکٹر امپرومنٹ پروجیکٹ فیزا: 138 ملین ڈالرز
پنجاب اریگیشن ایگری کلچر پروڈکٹیویٹی امپرومنٹ پروگرام فیزا: 250 ملین ڈالرز
پنجاب بیراجز امپرومنٹ پروجیکٹ فیزII: 145.6 ملین ڈالرز

تبصرہ

عالمی اداروں کی مدد سے پاکستان میں آبپاشی نظام میں انتظامی اصلاحت کا عمل 1960 کی دہائی سے کافی تیز نظر آتا ہے جو تاحال جاری ہے۔ ان اصلاحات کا مقصد ہمیشہ ایک ہی بیان کیا جاتا ہے یعنی زرعی پیداوار میں اضافے کے ذریعے معاشی ترقی حاصل کرنا، کسان کو خوشحال بنانا اور ملک سے بھوک اور غربت کا خاتمہ کرنا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے 1950 کی دہائی میں امریکہ میں متعارف کردہ مشینی زرعی پیداوار کا طریقہ ''سبز انقلاب'' درآمد کیا گیا جس کے لیے آبپاشی نظام میں اصلاحات ضروری تھیں کیونکہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک تو زیرکاشت رقبے میں اضافہ مقصود تھا جس کے لیے پانی کی مزید ضرورت تھی اور دوسرا سبز انقلاب کے تحت متعارف کروائے گئے زیادہ پیداوار والے بیج کی کاشت کے لیے روایتی بیج کے مقابلے کہیں زیادہ پانی درکار ہوتا ہے۔ ایسے میں آبپاشی نظام میں اصلاحات انتہائی ضروری تھیں۔

سبز انقلاب

پاکستان میں سبز انقلاب پالیسی کی بنیاد پر زیادہ پیداوار دینے والے بیج، زرعی ادویات، کیمیائی کھاد اور زرعی مشینری کے فروغ اور فروخت کے لیے عالمی بینک اور یوایس ایڈ جیسے اداروں نے مالی اور تکنیکی امداد فراہم کی اور اس سلسلے میں پانی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے آبپاشی نظام میں اصلاحات کا عمل شروع کیا۔ سبز انقلاب کے ذریعے امریکی اور دیگر بین الاقوامی کمپنیوں کے لیے پاکستان بیج، کھاد، زرعی ادویات اور زرعی مشینری کی فروخت کے لیے بڑی منڈی ثابت ہوا جس سے آج تک بیج، کھاد، زرعی ادویات اور زرعی مشینری بنانے والی کمپنیاں منافع کمارہی ہیں۔ یہ نقطہ اہم ہے کہ سبز انقلاب متعارف کرائے جانے سے پہلے پاکستان زرعی مداخل کے حوالے سے مکمل طور پر خودکفیل تھا۔

سبز انقلاب کے ملکی معیشت اور کسانوں پر اثرات

1960 کی دہائی میں پاکستان کی مجموعی قومی پیداوار میں واضح اضافہ تو ہوا لیکن اس سے پاکستان کے کسانوں کو کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچا کیونکہ ملک میں زراعت سے وابستہ آبادی کی اکثریت بے زمین کسانوں پر مشتمل ہے یا وہ بہت کم زرعی زمین کے مالک ہیں۔ پیداوار میں اس اضافے سے صرف اور صرف بڑے بڑے جاگیردار اور سرمایہ داروں نے فائدہ اٹھایا جن کے پاس زرعی مشینری، ادویات اور ہر بار فصل کے لیے بیج خریدنے کے لیے سرمائے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ابتداء میں سبز انقلاب کے لوازمات بیج، زرعی ادویات، کھاد اور زرعی مشینری پر حکومت کی جانب سے بڑے پیمانے پر زرتلافی بھی دی گئی جس کا بھرپور فائدہ بڑی بڑی زرعی زمین رکھنے والوں نے اٹھایا اور آج یہی طبقہ ملک میں نہ صرف زمیندار بلکہ سرمایہ دار اور حکمران بھی نظر آتا ہے۔

پیداوار اور غربت میں اضافہ

ملک میں زرعی پیداوار میں اضافے کے ذریعے کسان کو خوشحال بنانے اور غربت ختم کرنے کے دعوے کیے گئے اور ملکی ترقی کے راگ الاپے گئے لیکن حقیقت میں زرعی پیداوار میں بڑھوتری کے حوالے سے کوئی خاطر خواہ اضافہ نظر نہیں آتا۔ 1960 سے 2006 کے دوران بھرپور طریقے سے آبپاشی نظام میں اصلاحات اور سبز انقلاب کے باوجود پیداواری بڑھوتری میں کمی نیچے دیے گئے جدول میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جدول 1

سال	زرعی پیداوار میں بڑھوتری (فیصد)
1960	5.1
1970	2.4
1980	5.4
1990	4.4
2000-06	2.2

Source: Dr. Ishrat Husain. Pakistan's Growth Experience 1947-2007: Accessed from http://ishrathusain.iba.edu.pk/speeches/Pakistan_s_Growth_Experience_1947-2007.pdf

جدول 1 میں ظاہر کردہ زرعی پیداوار میں بڑھوتری جو 1960 میں 5.1 فیصد تھی 2000 سے 2006 میں 2.2 فیصد ہوگئی یعنی ان تمام منصوبوں سے ملکی زرعی معیشت تو مضبوط نہیں ہوئی البتہ ان چار دہائیوں میں ملک میں بین الاقوامی کمپنیوں کے بیج، کھاد، زرعی ادویات اور زرعی مشینری کی ایک وسیع منافع بخش منڈی ضرور ہاتھ آ گئی۔

پاکستان میں جس طرح سبز انقلاب سے زرعی معیشت مزید کمزور ہوگئی اسی طرح ملک میں غربت میں بھی کوئی واضح کمی نہیں آئی۔ زرعی مشینری کے فروغ نے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو مزدور بننے اور انتہائی کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور کیا کیونکہ سبز انقلاب کی پالیسیوں کے تحت زرعی مشینری کا استعمال کئی گنا بڑھ گیا۔ جہاں ایک ایکڑ فصل کی تیاری پورا دن لیتی تھی ٹریکٹر کے استعمال سے ایک گھنٹے میں مکمل ہوسکتی تھی۔ اس طرح لاکھوں ہاری فارغ کئے گئے جس سے بے زمین کسانوں کی تعداد میں بڑا اضافہ ہوا۔ اس تبدیلی سے جاگیرداروں کے منافع میں تو کئی گنا اضافہ ہوا لیکن مزدور کسان کی اجرت اور روزی میں کمی آتی گئی جس کے نتیجے میں غربت اور عدم مساوات معاشرے میں سنگین صورت اختیار کرچکی ہے۔

پاکستان میں 1963 سے 1970 تک غربت میں ہونے والا اضافہ درج ذیل جدول نمبر2 میں دیکھا جاسکتا ہے۔

جدول2

سال	غربت کی شرح (فیصد)
1963-64	40.24
1966-67	44.5
1969-70	46.53
1990-91	22.11
2000-1	34.5

Source: Dr. Ishrat Husain. Pakistan's Growth Experience 1947-2007: Accessed from http://ishrathusain.iba.edu.pk/speeches/Pakistan_s_Growth_Experience_1947-2007.pdf

اوپر دیئے گئے جدول کے مطابق غربت میں سب سے زیادہ اضافہ اس دوران نظر آتا ہے جب سبز انقلاب کی پالیسوں پرعمل درآمد شروع کیا گیا جس سے بڑے پیمانے پر کسان بیروزگار ہوگئے۔ جیسے کہ پہلے ذکر کیا گیا ہاری اس سے پہلے جاگیرداروں کی زمین پر حصہ پر کاشت کیا کرتے تھے اور اپنے ہی محفوظ کردہ بیج کاشت کرتے تھے اور فصلوں کی بیماریوں کا روایتی طریقوں سے سدباب کرتے تھے جس پر لاگت نہ ہونے کے برابر تھی۔ سبز انقلاب کی بدولت بڑی تعداد میں کسانوں کی بے زمینی اور اجرت میں کمی سے غربت کی شرح میں اضافہ یقینی تھا۔

ماحول کی تباہی

سبز انقلاب کے نام سے زیادہ پیداوار دینے والے بیج، کیمیائی کھاد، زرعی ادویات اور مشینری کے استعمال سے ماحولیاتی آلودگی میں ہونے والا اضافہ تاحال جاری ہے۔ زمین میں کیمیائی کھاد اور زرعی ادویات کی شکل میں استعمال کیا جانے والا مواد نے نہ صرف فصل دوست کیڑوں اور نباتات کوختم کررہا ہے بلکہ پودوں کو کھانے والے حشرات کے ذریعے دیگر جانوروں میں منتقل ہوتا جارہا ہے۔ حد یہ ہے کہ یہ کیمیائی زہر ہمارے پانی کے ذخائر زہرآلود کرتے جارہے ہیں اور پانی پر منحصر آبی حیات شدید خطرے سے دوچار ہے۔ سبز انقلاب نے خطے کی حیاتیاتی تنوع کو سخت نقصان پہنچایا جس کے اثرات موسمی بحران کی صورت نمودار ہورہے ہیں۔

صحت

سبز انقلاب کی ماحول دشمن پالیسیوں کے نتیجے میں استعمال ہونے والے کیمیکل اور زہر غذائی چکر کے تحت انسانی خوراک میں شامل ہوکر کینسر صرف سرطان جیسی خطرناک بیماریوں کی وجہ بن سکتا ہے بلکہ جلدی امراض، تنفس اور دیگر نفسیاتی و جسمانی امراض کا سبب بھی بن رہا ہے۔

پانی کی نجکاری

آبپاشی نظام میں انتظامی اصلاحات کا ایک اور پہلو بھی انتہائی اہم ہے۔ پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں نیولبرل پالیسیوں کے تحت پانی کے وسائل، اس کی ملکیت، اس کی تقسیم، اس تک رسائی کی نئی سرے سے تشریح کی جارہی ہے۔ پانی کی کمی کو جواز بنا کر پانی کے عوامی وسائل جس پر ہر انسان کا بنیادی اور فطری حق ہے، نجی ملکیت میں دیا جارہا ہے۔ آئی ایم ایف اور عالمی بینک اسے ایک نجی تجارتی جنس قرار دے کر مرحلہ وار ایک کاروبار کی شکل دے رہے ہیں جس میں موجودہ حکومت برابر کی حصہ دار ہے۔

عوامی خدمات کو حکومتی اختیار سے نکال کر نجی شعبے کے حوالے کرنے (اسٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ) کی پالیسوں کے تحت آبپاشی نظام پر حکومتی اختیار ختم کرنے، پانی کی قیمت یا ٹیکس پر حکومتی عمل دخل ختم کرکے منڈی کی بنیاد پر مقرر کرنے کے لیے ابتدائی طور پر واٹر یوزرز ایسوسی ایشنز قائم کرکے نچلی سطح پر نہری نظام کا انتظام، اس کی مرمت اور تعمیر کی حکومتی ذمہ داری کسانوں کو دے دی گئی اور اگلے مرحلے میں صوبائی محکمہ آبپاشی کے پانی کی ترسیل کے اختیارات اور آبیانے کی وصولی اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹی کو دے دی گئیں جو کسان تنظیموں کی مدد سے کنال کی سطح پر ایریا واٹر بورڈ کے ذریعے تمام تر منصوبوں کی تجاویز تیار کرتے ہیں اور اپنی حدود میں اس کے تمام تر انتظامات کے ذمہ دار بھی ہیں۔ پاکستان میں جہاں زرعی زمین پر بااثر جاگیردار اور بڑے بڑے سرمایہ دار قابض ہوں وہاں یہ نظام کسی صورت چھوٹے اور ان بے زمین کسانوں کے لیے جو بٹائی اور دیگر شرائط پر کاشت کاری کرتے مساوات پر مبنی نہیں ہوسکتا۔ اس میں شک نہیں کہ کسان تنظیموں کے نمائندوں کے چناؤ کے وقت اپنے اثر و رسوخ کی بدولت بااثر زمیندار ہی کامیاب ہوسکتے ہیں یا پھر ایسے کسانوں کا چناؤ کروایا جاسکتا ہے جو ان کے زیر اثر میں ہوں۔ ظاہر ہے اگر سیاسی و معاشی طاقت بڑے زمینداروں کے ہاتھ ہوتو کسی صورت پانی کی تقسیم کے معاملے پر انصاف کی توقع نہیں

رکھی جاسکتی اور اس صورتحال میں چھوٹے کسانوں کی پانی کے حوالے سے شکایات پر شنوائی مشکل نظر آتی ہے۔

پاکستان کے آبی وسائل اور وسیع آبپاشی نظام کی بنیاد پر پاکستان کا غذائی تحفظ اور ملکی معیشت قائم ہے۔ عالمی بینک، یو ایس ایڈ اور دیگر امدادی اور مالیاتی اداروں کے تمام تر منصوبوں کا مقصد عالمی سرمایہ دار ممالک کی ان پالیسیوں کا نفاذ ہے جس سے ملکی آبی وسائل اور اس کی معیشت پر ان ممالک اور ان کی سرمایہ کار کمپنیوں کا غلبہ قائم ہو اور وہ اس کے استعمال کو ایسا رخ دیں جس سے کارپوریٹ زراعت کو فروغ دیتے ہوئے بھاری منافع کمایا جاسکے۔ آبی وسائل اور اس پر قائم آبپاشی نظام پر سرکاری اختیار کو مرحلہ وار ختم کرنے کے لیے ان اداروں کے یہ منصوبے 1960 کے عشرے سے ہی جاری ہیں جب آبی شعبے کے امریکی ماہر گلبرٹ کورے نے نشاندہی کی کہ پاکستان کا آبپاشی نظام عالمی سطح پر اہمیت کا حامل اور بڑے پیمانے پر زرعی پیداوار دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس بنیاد پر ہی امریکی ادارے نے اس نظام میں اصلاحات کا عمل شروع کیا اور 1981 میں آبپاشی نظام کو نچلی سطح پر کسانوں کے حوالے کرنے کا عمل کافی حد تک مکمل کرلیا۔ دوسرے مرحلے میں صوبائی اریگیشن اینڈ ڈرینج اتھارٹیوں کے قیام سے نہ صرف آبپاشی نظام کی تعمیر و مرمت اور انتظامی معاملات بلکہ ایریا واٹر بورڈ اور کسان تنظیموں کے قیام سے آبیانہ یا پانی پر ٹیکس کی وصولی کا اختیار بھی ان ہی تنظیموں کی ذمہ داری قرار دے دی گئی جس کا اگلہ مرحلہ امکانی طور یہی نظر آتا ہے کہ چھوٹے یا بڑے پیمانے پر نجی شعبہ کو اس نظام میں شراکت دار بنایا جائے گا جیسا کہ عالمی بینک نے اپنی 2005 کی رپورٹ میں واضع کیا ہے۔

بے زمینی اور کارپوریٹ فارمنگ کے لیے جاری زمینوں قبضوں اور سبز انقلاب کی عنایتوں کی بدولت پیداواری لاگت میں اضافے کی وجہ سے کسان زراعت چھوڑنے پر مجبور ہورہے ہیں مزید پانی کی مجوزہ نجکاری یا چھوٹے اور بے زمین کسان اور بڑے بڑے زمینداروں کی تفریق کیے بغیر آئی ایم ایف اور عالمی بینک کے اشارے پر آبیانے کی شرح میں اضافہ غریب کسانوں کو مزید بھوک اور غربت میں دھکیلنے کا سبب بنے گا۔ نہ تو زمینی اصلاحات پر زور دیا جارہا ہے کہ کم از کم بڑے زمینداروں اور چھوٹے اور بے زمین کسانوں کی تفریق کو کم کیا جاتا مزید ایسی کسان دشمن اصلاحات کی جارہی ہیں کہ چھوٹے کسان بالکل ہی ناپید ہوجائیں۔ مزید یہ کہ بجائے اس کے کہ بڑی بڑی زرعی جاگیروں پر آبیانے کی شرح میں اضافہ کرکے پورے آبپاشی نظام کے انتظامی معاملات چلائے جاتے جس سے اس نظام کی افادیت میں اضافہ اور اسے توسیع دے کر مزید اراضی کو زیر کاشت لایا جاتا آبپاشی نظام میں لائی گئی اصلاحات سے حکومتی خزانے کو آمدنی سے محروم کیا جارہا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی زرعی پالیسی سازی میں کارپوریٹ زراعت کو بے تحاشہ فروغ دیا جارہا ہے۔ زرعی پانی کی نجکاری اس پالیسی کا ایک حصہ ہے جس کے ذریعے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو زراعت سے بے دخل کرکے زراعت کو مکمل طور پر کاروباری صنعتی زراعت میں تبدیل کردیا جائے گا۔

پاکستان میں اس وقت اشد ضرورت ہے کہ عوام بالخصوص کسان مزدور اپنے آبی وسائل پر حق اور اس کے پائیدار استعمال کے لیے جدوجہد کا آغاز کریں اور سرمایہ دار ممالک کے اشاروں پر حکومتی پالیسیوں کے ذریعے ہمارے آبی وسائل پر قبضے کی کوششوں کو ناکام بنادیں جو مشکل ضرور ہے لیکن ہرگز ناممکن نہیں۔

حوالہ جات

1. World Bank. "Pakistan country water resources assistance strategy water economy: Running dry." World Bank, 2005, p. vii. Accessed from http://siteresources.worldbank.org/PAKISTANEXTN/Resources/PWCAS-Title&Intro.pdf

2. Observer Research Foundation, Stimson and Sustainable Development Policy Institute. "Connecting the drops: An Indus Basin roadmap for cross-border water research, data sharing, and policy coordination."Observer Research Foundation, Stimson and Sustainable Development Policy Institute, 2013, p. 13. Accessed from https://www.sdpi.org/publications/files/connecting_the_drops_stimson.pdf

3۔ شریف ثناء ''دریا کے کنارے آباد بستیاں اور موسمی بحران'' چیلنج، جلد8، شمارہ 2، مئی تا اگست 2015، صفحہ 11۔

4. Pakistan Water & Power Development Authority. "Introduction to WAPDA." WAPDA. Accessed from http://www.wapda.gov.pk/index.php/about-us/present-setup-2

5۔ شریف ثناء ''دریا کے کنارے آباد بستیاں اور موسمی بحران'' چیلنج، جلد8، شمارہ 2، مئی تا اگست 2015، صفحہ 11۔

6. Mekonnen, Dawit, Channa, Hira; and Ringler, Claudia. "The impact of water users' associations on the productivity of irrigated agriculture in Pakistani Punjab." Milwaukee, WI, USA: Agricultural and Applied Economics Association, 2014, p.1. Accessed from http://ageconsearch.umn.edu/bitstream/170482/2/Khal_Panchayat_Paper_v2_AAEA_Submitted_Paper.pdf

7. Pakistan Water & Power Development Authority. "Tarbela Dam." WAPDA. Accessed from http://www.wapda.gov.pk/index.php/projects/hydro-power/operational/tarbela-dam

8. Lawton P. Bourn Jr (ed). "The On farm water management program." The United States Agency for International Development, p. 7. Accessed fromhttp://pdf.usaid.gov/pdf_docs/Pnaba250.pdf

9. Ibid, 25.

10. Ibid, 27.

11. Mekonnen, Dawit, Channa, Hira; and Ringler, Claudia. "The impact of water users' associations on the productivity of irrigated agriculture in Pakistani Punjab."

12. Lawton P. Bourn Jr (ed). "The On farm water management program," p. 30.

13. Punjab Irrigation and Drainage Authority. "Background."Government of Punjab, 2014. Accessed from http://pida.punjab.gov.pk/background

14. Indus River System Authority. "IRSA Act No. XXII of 1992."IRSA, 2011. Accessed from http://pakirsa.gov.pk/irsapublic/LegalProceedings.aspx#CHAPTER II

15. Punjab Irrigation and Drainage Authority. "Overview." Government of Punjab, 2014.

(بقیہ حوالہ جات صفحہ نمبر 44 پر دیکھیں)

گوادر میں 2,281 ایکڑ زمین چین کے حوالے

گوادر، پاکستان میں آزاد تجارتی علاقے کے قیام کے لیے گیارہ نومبر کو ایک تقریب میں باضابطہ طور پر 2,281 ایکڑ زمین 43 سالہ لیز پر چائنہ اوورسیز پورٹس ہولڈنگ کمپنی (China Overseas Ports Holding Company/COPHC) کے حوالے کی جائے گی۔ گوادر میں ہونے والی اس تقریب میں چینی وفد وائس چیئرمین قومی ترقی و اصلاحات وانگ زائیڈو (Wang Xiado) کی قیادت میں شرکت کرے گا جبکہ پاکستانی وفد کی نمائندگی وفاقی وزیر منصوبہ بندی وترقی احسن اقبال کرینگے۔ تقریب میں وزیراعلیٰ بلوچستان ڈاکٹر عبد المالک بلوچ سمیت وفاقی وزیر بندرگاہ و جہاز رانی کامران مائیکل کی شرکت بھی متوقع ہے۔ وزارت بندرگاہ و جہاز رانی کے ایک اعلیٰ افسر کے مطابق حکومت پہلے ہی گوادر کو اگلے 23 سالوں کے لیے آزاد تجارتی علاقہ قرار دے چکی ہے۔ چائنہ اوورسیز پورٹس ہولڈنگ کمپنی لمیٹڈ گوادر بندرگاہ کے منصوبے اپنی تین کمپنیوں کے ذریعے مکمل کرے گی جن میں گوادر انٹرنیشنل ٹرمینل، گوادر مرین سروسز لمیٹڈ اور گوادر فری زون کمپنی لمیٹڈ شامل ہیں۔

گوادر انٹرنیشنل ٹرمینل بندرگاہ پر تجارتی معاملات سے متعلق انتظامی امور کی ذمہ دار ہوگی۔ گوادر میرین سروس لمیٹڈ بندرگاہ پر آپریشن سے جڑی سہولیات فراہم کرنے کی ذمہ دار ہوگی اور گوادر فری زون کمپنی آزاد تجارتی علاقے میں تعمیر وترقی سے متعلق سرمایہ کار کمپنیوں کو خدمات کی فراہمی اور دیگر امور کی ذمہ دار ہوگی۔ آزاد تجارتی علاقہ باضابطہ طور پر منتقل ہونے کے بعد بندرگاہ کے تمام تجارتی معاملات چینی حکام چلائیں گے۔ اس کے علاوہ اس تقریب میں گوادر میں اسکول اور طبی مراکز کی تعمیر کے منصوبوں کا بھی افتتاح کیا جائے گا۔ یہ اسکیم بھی چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے کا حصہ ہے جو مغربی چین کو پاکستان میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، توانائی اور ذرائع آمدورفت میں 46 بلین ڈالرز کی سرمایہ کاری کے ذریعے بحیرہ عرب سے ملانے کا منصوبہ ہے۔

پاکستان بندرگاہ کی حفاظت کے لیے دس سے پچیس ہزار محافظوں پر مشتمل خصوصی حفاظتی دستا بھی تشکیل دے رہا ہے۔ گوادر پورٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل عبد الرزاق درانی کے مطابق بلوچستان حکومت آزاد تجارتی علاقے کی تعمیر کے لیے زمین حاصل کرنے کے لیے تقریباً 62 ملین ڈالرز خرچ کرچکی ہے۔ گوادر بندرگاہ 2007 میں چین کی تکنیکی اور 248 ملین ڈالرز کی مالی معاونت سے تعمیر کی گئی تھی۔

(پیر محمد، دی ایکسپریس ٹریبیون، 10 نومبر، 2015، صفحہ 11)

کھاد کے متوازن استعمال کا پرچار

اقوام متحدہ کا خوراک و زراعت کا ادارہ (Food and Agriculture Organization/FAO) نجی شعبے کی شراکت سے زرعی مداخل کے مناسب اور متوازن استعمال کے لیے کسانوں کو درست کھاد، درست نرخ پر، صحیح وقت اور جگہ پر استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اس سلسلے میں FAO (ایف اے او) نے وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق، پاکستان ایگریکلچر ریسرچ کونسل، امریکی محکمہ زراعت اور انٹرنیشنل پوٹاش انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے ''غذائی تحفظ کے لیے کھاد کے متوازن استعمال'' کے عنوان سے ساہیوال میں ایک ورکشاپ منعقد کیا جس کا مقصد پائیدار زراعت اور غذائی تحفظ کے لیے متوازن کھاد کے استعمال اور زمین کی زرخیزی کی اہمیت کو اجاگر کرنا تھا۔ ایف اے او ملک بھر میں اس طرح کے ورکشاپ منعقد کر رہی ہے۔ ملتان، کراچی اور لاہور میں کپاس، چاول اور آم کے کاشتکاروں کے لیے بھی ایسے ورکشاپ منعقد کیے جاچکے ہیں۔

(دی نیوز، 8 اکتوبر، 2015، صفحہ 15)

فرانس کا وارسک ڈیم منصوبے کے لیے 5.05 بلین روپے دینے کا اعلان:

فرانس نے وارسک ڈیم کی مرمت و بحالی منصوبے کے لیے آسان شرائط پر قرض اور امداد کی مد میں مجموعی طور پر 5.05 بلین روپے دینے کا اعلان کیا ہے۔ پاکستان میں فرانسیسی سفیر مارٹن ڈورنس (Martine Dorance)، فرانسیسی ادارہ برائے ترقی (French Development Agency/AFD) کے پاکستان میں ڈائریکٹر جیکی ایمپرو (Jacky Amprou) اور سیکریٹری اقتصادی امور سلیم سیٹھی نے اس حوالے سے معاہدے پر دستخط کیے۔ AFD (اے ایف ڈی) کے بورڈ نے مجموعی طور پر 41.5 ملین یورو کی منظوری دی ہے جس میں واپڈا پن بجلی تربیتی مرکز (WAPDA Hydropower Training Centre) کے لیے 1.5 ملین یورو بھی شامل ہیں۔

اے ایف ڈی نے 4.5 ملین یورو کی اضافی امداد کا بھی بندوبست کیا ہے جو یورپی یونین کی طرف سے (ایشیا میں سرمایہ کاری سہولیات کے تحت) وارسک ڈیم کی بحالی و مرمت میں مدد دینے کے لیے منظور کی گئی ہے۔ اس امداد سے ماحولیاتی مسائل، سیلاب سے بچاؤ اور ڈیم کی صفائی کے انتظامی مسائل حل ہونگے۔ اس کے علاوہ مقامی آبادیوں میں ترقی اور واپڈا کی مرمت اور دیکھ بھال کے حوالے سے پیشہ ورانہ صلاحیت میں بھی اضافہ ہوگا۔ یہ تمام اقدامات واپڈا کی صلاحیتوں میں اضافے

کے لیے کیے جانے والے طویل المدتی منصوبے کا حصہ ہونگے۔ منصوبے کی تکمیل سے وارسک ڈیم کی موجودہ 243 میگاواٹ پیداواری صلاحیت کو اگلی مدت تک یقینی بنایا جاسکے گا۔ فرانسیسی سفارت خانے کی جاری کردہ پریس ریلیز کے مطابق پاکستان میں توانائی اور پانی کے شعبوں میں فرانس کی شراکت داری 321.5 ملین یورو سے زائد ہے جو چالیس بلین روپے بنتی ہے۔

(ڈان، 23 ستمبر، 2015، صفحہ 5)

موسمی تباہی سے نمٹنے کے لیے بڑھتے ہوئے اخراجات کے حوالے سے جنوبی ایشیاء سرفہرست ہے

ایشائی ترقیاتی بینک کے تجزیہ کار نے جنوبی ایشیائی ممالک کو خبردار کیا ہے کہ اگر عالمی درجہ حرارت میں اضافہ دو ڈگری سیلسیس تک بھی محدود رہا تب بھی 2050 تک ان ممالک کی مجموعی پیداوار میں سالانہ 1.3 فیصد کمی ہوسکتی ہے اور اس صدی کے بقیہ پچاس سالوں میں یہ کمی 2.5 فیصد تک بڑھ سکتی ہے۔ عالمی درجہ حرارت میں ہونے والا اضافہ دو ڈگری سیلسیس سے اوپر گیا تو یہ پیداواری نقصان بلترتیب 1.8 فیصد اور 8.8 فیصد ہوسکتا ہے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک کی ڈائریکٹر برائے موسمی تبدیلی پریتی بنداری نے کہا ہے کہ جنوبی ایشیا موسمی تبدیلی سے متاثر ہونے والے علاقوں میں سرفہرست ہے۔ اس خطے کو موسمی شدت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے واقعات میں اضافے کا سامنا ہے۔ بینک کے اندازے کے مطابق اگر درجہ حرارت میں اضافے کی موجودہ شرح برقرار رہی تو جنوبی ایشیا کو اکیسویں صدی کے اختتام تک موسمی تبدیلی کے منفی اثرات سے نمٹنے کے لیے سالانہ تقریباً 73 بلین ڈالرز درکار ہونگے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ اس صدی کے اختتام پر ان ممالک کو عالمی درجہ حرارت میں 3.5 سے چار ڈگری سیلسیس اضافے کا سامنا ممکن ہے۔ اگر ممالک درجہ حرارت میں ہونے والے اضافے کو 2.5 ڈگری سیلسیس تک محدود رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ لاگت کم ہوکر تقریباً 40 بلین ڈالرز سالانہ ہوسکتی ہے۔

جنوبی ایشیائی ممالک کے سرکاری حکام کے مطابق وہ موسمی تبدیلی کے خطرات سے آگاہ تو ہیں پر اقتصادی ترقی اور موسمی تبدیلی سے نمٹنے کے لیے عوامل میں توازن رکھنا مشکل ہے کیونکہ پالیسی سازی سست روی کا شکار ہیں۔ بنگلہ دیش کے سکریٹری برائے جنگلات و ماحولیات کمال الدین احمد کہتے ہیں کہ وہ موسمی تبدیلی کے بڑھتے ہوئے واقعات سے آگاہ ہیں۔ اس حوالے سے ابھی انہیں بہت سے اقدامات کرنا ہونگے لیکن اس وقت ان کی ترجیح بنگلہ دیش کی 160 ملین آبادی کو غذائی ضروریات فراہم کرنا ہے اور اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ موسمی تبدیلی کے حوالے سے ایسی پالیسی اختیار کی جائے جس سے ان کی معاشی بڑھوتری میں کمی نہ ہو۔ بنگلہ دیش کے ڈائریکٹر محکمہ موسمیات ایل چندر پالا نے کہا ہے کہ اگرچہ بارشوں کے نظام میں تبدیلی اور بڑھتا ہوا درجہ حرارت اب واضح ہے پر ضرورت ہے کہ اس حوالے سے وسیع پیمانے پر پالیسی سازی اختیار کی جائے۔

ایشیائی ترقیاتی بینک کی ڈائریکٹر موسمی تبدیلی پریتی بنداری کہتی ہیں کہ جنوبی ایشیائی ممالک کے لیے بہت سی ترجیحات ہیں لیکن اس پیچیدہ صورتحال میں یہ ضروری ہے کہ یہ ممالک ترقیاتی اہداف کو موسمی تبدیلی کے ساتھ جوڑیں۔ ترقی پزیر ممالک کیونکہ اپنی موسمی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے ملکی ترقی پر سمجھوتہ کرنا پسند نہیں کرتے اس لیے وہ اور دیگر ماہرین اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ یہ ممالک اپنے ترقیاتی منصوبوں کو ماحول دوست بنائیں بجائے اس کے کہ موسم سے مطابقت کے لیے علیحدہ سے اقدامات کریں۔

بینک کی رپورٹ کے مطابق بنگلہ دیش میں 2080 تک چاول کی سالانہ پیداوار میں 23 فیصد تک کی ہوسکتی ہے جہاں زراعت تقریباً آدھی (60 ملین) افرادی قوت کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ اگر سطح سمندر میں ایک میٹر اضافہ ہوتا ہے تو ڈھاکہ کا 14 فیصد رقبہ زیر آب آسکتا ہے جبکہ جنوب مشرقی کھلنہ کا علاقہ اور سندر بن کا حساس ماحولیاتی نظام پر بہت برے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔

نیپال بھی اکیسویں صدی کے اختتام تک برفانی پہاڑ پگھلنے اور دیگر موسمی آفات کی وجہ سے اپنی مجموعی قومی پیداوار کے دس فیصد حصے سے محروم ہوسکتا ہے جبکہ اس کے پڑوسی ملک بھارت میں زرعی پیداوار میں 2050 تک 14.5 فیصد کمی ہوسکتی ہے۔ بھارت کے 8,000 کلومیٹر طویل ساحل کو بھی سطح سمندر میں اضافے سے شدید معاشی خطرات لاحق ہوسکتے ہیں۔ بھارت میں اس وقت کم از کم 85 فیصد زراعت کے لیے آبپاشی کی ضرورت ہوتی ہے اور درجہ حرارت میں اضافے کے ساتھ پانی کی ضروریات میں بھی اضافے کا امکان ہے جبکہ بھارت کے زیرزمین پانی میں بھی کمی کا خدشہ ہے۔

سری لنکا، جو پہلے ہی مون سون کے بدلتے ہوئے نظام کی وجہ سے اپنی چاول اور دیگر اجناس کی پیداوار میں اتار چڑھاؤ کا شکار ہے، کو بینک نے خبردار کیا ہے کہ اس کی چائے کی پیداوار 2080 تک کم ہوکر آدھی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ سری لنکا میں حشرات کے کاٹنے سے پھیلنے والی بیماریوں میں بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔ 2007 سے سری لنکا میں ڈینگی بخار میں واضح اضافہ ہوا ہے۔ پچھلے سال (2014) کے نو مہینے کے دورانیہ میں تقریباً 29,000 افراد ڈینگی بخار کا شکار ہوئے جبکہ اس سال اتنے ہی وقفہ میں 20,058 افراد اس مرض کا شکار ہوئے ہیں۔

(Perera, Amantha. "South Asia 'at front lines' of mounting climate costs - bank." Reuters. September 10, 2015. Accessed from http://www.reuters.com/article/southasia-climate-economies-idUSL5N11F3A720150910)

وفاقی دارالحکومت کا خوراک کے قانون میں ترامیم کا فیصلہ

پنجاب میں مضرصحت گوشت فروخت کرنے والوں کے خلاف جاری مسلسل کارروائیوں

اور ان افواہوں کے بعد کہ صوبے میں مردہ جانوروں کا گوشت بھی فروخت کیا جارہا ہے اسلام آباد کی شہری انتظامیہ نے خوراک کے قانون میں ترمیم پر غور شروع کر دیا ہے۔ اسلام آباد میں مذبح خانے کا نہ ہونا اس امکان کو تقویت دیتا ہے کہ اسلام آباد میں مضرِ صحت گوشت یہاں تک کہ حرام گوشت فروخت ہو رہا تھا۔ گزشتہ کچھ ہفتوں سے پنجاب میں ان اطلاعات پر کہ صوبے بھر میں قصابوں کی جانب سے مردہ جانوروں اور گدھے کا گوشت فروخت کیا جارہا ہے، اور کچھ ہوٹلوں میں استعمال بھی ہو رہا ہے، کارروائی کا آغاز کیا گیا تھا۔

اسلام آباد انتظامیہ نے اس معاملے پر ڈپٹی کمشنر مشتاق احمد کی صدارت میں تمام متعلقہ محکموں کا مشاورتی اجلاس منعقد کیا۔ اسلام آباد میں زیادہ تر گوشت کیونکہ روات اور سہالہ سے آتا ہے اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ مضرِ صحت گوشت کی فروخت پر نظر رکھنے کے لیے طریقہ کار کو مزید سخت بنایا جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر کے مطابق موجودہ خوارک کا قانون مضرِ صحت گوشت فروخت کرنے والوں کو صرف تین ماہ قید یا چند سو روپے کا جرمانہ یا دونوں سزائیں ایک ساتھ عائد کرتا ہے۔ خوراک کے قانون میں ترمیم کر کے سزا میں اضافے اور اسے ناقابلِ ضمانت جرم قرار دینے کی ضرورت ہے۔ قانون میں ترمیم کے لیے کافی وقت درکار ہوگا۔ مسودہ کی تیاری کے بعد اسے وزارت قانون کو جائزے کے لیے بھیجا جائے گا۔ وزارت کی منظوری کے بعد اس قانون کو ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے نافذ کیا جاسکے گا۔

(اکرام جنیدی، ڈان، 7 ستمبر، 2015، صفحہ 4)

خوراک کی تجارت دنیا میں بھوک کے خاتمے کے لیے ناگزیر ہے: ایف اے او

ایف اے او کی جاری کردہ رپورٹ (The State of Agricultural Commodity Markets 2015) میں کہا گیا ہے کہ زرعی اشیاء کی تجارت میں اضافے سے ہی دنیا میں بھوک کا خاتمہ ممکن ہے اگر آزاد تجارتی پالیسیوں سے غذائی تحفظ کو کوئی خطرہ نہ ہو تو۔ تجارت خوراک کی دستیابی، اس تک رسائی، اس کے استعمال سمیت غذائی تحفظ کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 2030 تک کے لیے مقرر کیے گئے پائیدار ترقی کے اہداف میں دنیا میں بھوک کا خاتمہ اہم ترین ہدف ہے اور تجارت اس ہدف کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ غذائی اور زرعی اشیاء کی عالمی تجارت، جو گزشتہ دہائی میں مالیت کے اعتبار سے تقریباً تین گنا بڑھی ہے، میں اضافہ ایشیا، شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں درآمدات کی صورت جبکہ لاطینی امریکہ میں برآمدات کی صورت جاری ہے۔ زرعی تجارت میں اضافہ، بھوک، غذائی عدم تحفظ اور غذائی کمی کا خاتمہ کرتا ہے نہ کہ اضافہ۔

رپورٹ کے مطابق مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح اس بات کو یقینی کیا جائے کہ زرعی تجارت کا پھیلاؤ بھوک کے خاتمے، خوراک میں کمی اور عدم تحفظ کے خلاف ہے تاکہ اس کو بڑھاوا دینے کے لیے۔

اس رپورٹ کا مقصد تجارت اور غذائی تحفظ کے درمیان تعلق کو واضح کرنا اور اس موضوع پر حکومتی تجارتی پالیسی پر رہنمائی فراہم کرکے اس موضوع کے خلاف نظریاتی دھڑوں میں مخالفت کو کم کرنا ہے۔ تجارت کئی اقتصادی اور سماجی عناصر پر اثرانداز ہوتی ہے جو آخر کار آبادی کے غذائی تحفظ اور غذائیت بشمول بڑھوتری، آمدنی، غربت کی سطح، خوراک کی قیمت اور حکومتی بجٹ کا تعین کرتی ہے۔ تجارت ازخود کوئی خطرہ ہے نہ حل پر یہ ایسے مسائل اور خطرات پیش کرتی ہے جن کا پالیسی بنانے اور فیصلہ سازی کے وقت خیال رکھنا چاہیے۔ رپورٹ میں ایسے خطرات کا حوالہ دیا گیا ہے جیسے خوراک کی درآمد کے لیے عالمی منڈی پر انحصار جس میں اچانک قیمتوں میں اضافہ ہوسکتا ہے جس سے درآمدی ملک تجارتی شراکت داروں اور کم دورانیہ پر مبنی منڈی میں جھٹکوں کے ہاتھوں کمزور ہوجاتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق تحفظ خوراک کے لیے ایسی تجارتی پالیسی جو سب پر یکساں لاگو ہو ممکن نہیں۔ رپورٹ تجویز کرتی ہے کہ تجارت اور متعلقہ حکومتی پالیسی مختلف ممالک میں مختلف ہونگی اور وقت کے ساتھ جیسے جیسے معیشت ترقی کرے گی تبدیل ہوں گی۔

(ڈان، 10 دسمبر، 2015، صفحہ 11)

حکومتی گوداموں میں گندم ضائع

سندھ کے وزیر خوراک سید ناصر حسین شاہ نے اسمبلی کو بتایا کہ وفاقی حکومت کی ناقص پالیسیوں اور برآمدات پر عائد کردہ شرائط کی وجہ سے حکومتی گوداموں میں گندم کی بڑی مقدار خراب ہورہی ہے۔ وفاقی حکومت نے دو سال پہلے یوکرین سے ناقص گندم درآمد کی۔ اس فیصلے کی وجہ سے اب سندھ حکومت کو اپنا اضافی گندم فروخت کرنے اور ذخیرہ کرنے میں مسائل کا سامنا ہے کیونکہ حکومتی گوداموں میں صرف 700,000 ٹن گندم ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔ وفاقی حکومت نے صوبے میں بڑی مقدار میں موجود اضافی گندم برآمد کرنے کے لیے 45 ڈالرز فی ٹن زرتلافی میں سے اپنے حصے کی رقم دینے کا وعدہ بھی ابھی تک پورا نہیں کیا۔ ملاوٹ شدہ غیر معیاری گندم بھی پنجاب سے سندھ غیر قانونی طور پر لایا گیا کے اس لیے لازمی غذائی اشیاء کی صوبوں کے درمیان غیر قانونی آمد و رفت روکنے کے لیے نگران کمیٹیاں قائم کی جارہی ہیں۔

(دی نیوز، 15 دسمبر، 2015، صفحہ 14)

بیج کا کاروبار

روزنامہ ڈان میں چھپنے والے ایک مضمون کے مطابق جنوبی پنجاب میں کپاس کے کاشتکار غیر معیاری بیجوں اور فصل پر کیڑوں کے شدید حملے کی وجہ سے سنگین بحران کا سامنا کررہے ہیں۔ ناقص بیج اور کیڑوں کے حملے کا تعلق جینیاتی فصلوں کے تیزی

سے پھیلاؤ سے ہے جس نے دنیا بھر میں عوامی اعتماد کو ٹھیس پہنچانا شروع کر دی ہے۔ یہ لہر اب جینیاتی ٹیکنالوجی کے خلاف مظاہروں میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اس بیج کے خلاف مخالفت نے اس وقت شدت پکڑی جب اس کو بھوک کے خاتمے کے لیے معجزاتی بیج قرار دیا گیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہائبرڈ فصلیں بھی جس میں مختلف زندہ اقسام کے جینیاتی مواد (Genomes) کا ملاپ کیا جاتا ہے عالمی سطح پر اپنانے کے لیے ایک نئی اور غیر تصدیق شدہ ٹیکنالوجی ہے۔ جینیاتی ٹیکنالوجی کے حوالے سے عوامی شعور میں اضافہ ہو رہا ہے اور لوگوں نے پیداوار میں اضافے کے لیے بیج میں جینیاتی تبدیلیوں اور کیڑوں کے حملے سے پیشگی بچاؤ پر سوالات اٹھانا شروع کر دیے ہیں۔ اس کے علاوہ عالمی ادارہ صحت کی طرف سے بھی جینیاتی ٹیکنالوجی سے متعلق اٹھائے گئے صحت کے مسائل نے بھی ابہام کو بڑھایا ہے جبکہ کئی ممالک میں ان کی کاشت پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

پاکستان میں جینیاتی بیجوں کی داستان مختلف ہے۔ جینیاتی بیج بنانے والی ملٹی نیشنل کمپنیاں پنپتی نظر آ رہی ہیں۔ پاکستانی زراعت کو بڑے پیمانے پر جاری جینیاتی کپاس کی کاشت سے خطرہ ہے جس کی مقامی آب و ہوا اور ماحول میں نہ آزمائشی کاشت کی گئی اور نہ ہی اس کے اثرات کو مکمل طور پر سمجھا گیا۔ پاکستان میں جینیاتی ٹیکنالوجی نسبتاً نئی ہے اور اب تک ہم ان ممالک کے خوفناک تجربات سے سیکھنے میں ناکام ہیں جو ہم سے پہلے اس ٹیکنالوجی کا شکار ہوئے ہیں۔ پاکستان میں کپاس کا بیج 2005 میں غیر قانونی طور پر ملک میں لایا گیا جب جینیاتی بیج کی منتقلی اور استعمال کے لیے کوئی قانونی ضابطہ اور ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ بھارت میں کسانوں کی خودکشیوں کی اطلاعات کی روشنی میں پاکستان میں یہ عمل انتہائی خطرناک تھا لیکن 2010 میں حکام نے ملک میں بی ٹی کپاس کی کاشت کی منظوری دے دی جس کے بعد ملک میں کپاس کے 60 فیصد زیر کاشت رقبے پر بی ٹی کپاس کاشت ہونے لگی اور آج یہ رقبہ 85 فیصد بتایا جاتا ہے۔

زرعی ماہر طاہر حسنین کی جانب سے جینیاتی ٹیکنالوجی پر کی گئی تحقیق کے مطابق بی ٹی کپاس کی کاشت مہنگی ہے، اس کے علاوہ کیمیائی کھاد، پانی اور زرعی ادویات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے جس سے پیداواری لاگت بڑھ جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ نئے کیڑے اور بیماریاں ابھر کر سامنے آئی ہیں کیونکہ بی ٹی کپاس میں کیڑوں کے حملے سے بچاؤ کے لیے ضروری زہریلے مواد (toxin) کی کارکردگی کم ہونے کی بناء پر کیڑوں میں ان کے خلاف قوت مدافعت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ جینیاتی بیج سے توقع کی جاتی ہے کہ اس پر کیڑوں کا حملہ کم ہوگا۔ اس صورتحال میں اسی بیج کمپنی کی تیار کردہ کیڑے مار زرعی ادویات کی فروخت بڑھ جاتی ہے۔

اس کے علاوہ غذائی فصلوں کی جگہ نقد آور فصلوں کی کاشت کے رجحان کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ جینیاتی بیجوں کی کاشت اور کٹائی کا دورانیہ مختلف ہونے سے گندم کی کاشت کا وقت نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ 15-2014 میں گندم کی پیداوار میں کمی واقع ہوئی اور اب کپاس کی پیداوار بھی اپنا وہ ہدف بھی حاصل نہیں کر سکی جو بی ٹی کپاس کی آمد سے پہلے 2004 میں حاصل ہوتا تھا۔

پاکستانی حکومت بین الاقوامی بائیوٹیک کمپنیوں کے مفادات کا تحفظ کر رہی ہے۔ ان بائیوٹیک کمپنیوں کی مالی قوت اس قابل ہے کہ وہ پالیسی سازوں کو اپنے ''سیاسی/معاشی مفاد'' کی طرف مائل کر سکیں اور پالیسی سازوں کی بھی اتنی قوت ہے کہ وہ ان کی طرف سے کی گئی ''مہربانیاں'' تسلیم کریں۔ ہمارے پارلیمانی ارکان بھی کچھ مختلف نہیں ہیں جنھوں نے 1976 کے سیڈ ایکٹ میں ''ترمیم کو منظور کیا کیونکہ وہ جدید بیج کی صنعت کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا تھا''۔

ملکی قوانین میں تبدیلی کے لیے دباؤ امریکہ کی طرف سے آتا ہے جو چاہتا ہے کہ پاکستان ڈبلیو ٹی او قوانین کے تحت اپنی ذمہ داریاں پوری کرے اور نجی بیج کمپنیوں کے لیے اپنی منڈی کو مزید وسعت دے۔ بیج کے قانون میں ترمیم سے پہلے بنیادی طور پر بیج کی پیداوار سرکاری شعبے میں ہو رہی تھی اس ترمیمی قانون نے اب دیوہیکل بیج کمپنیوں کے لیے پاکستانی منڈی میں دروازے کھول دیے ہیں۔

پاکستان میں بڑے پیمانے پر بی ٹی کپاس کے بیج پر تحقیق اور مقامی ماحول میں اس کی آزمائش نہ کیے جانے پر تنقید کے بعد 2011 میں امریکہ نے پاکستانی زرعی تحقیقاتی اداروں کو بی ٹی کپاس پر تحقیق کے لیے 5.5 ملین ڈالرز ادا کیے۔ اس میں حیرت کی بات نہیں کہ اس تحقیق کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

بی ٹی کپاس ایک واضح مثال ہے کہ کس طرح کمپنیاں دھوکہ دہی، کمزور قانونی ضابطوں اور بدعنوان حکمران طبقے سے ساز باز کے ذریعے اپنا غلبہ قائم رکھتی ہے اور یہ طبقہ ہی ان کمپنیوں کے مقاصد کی تکمیل کے لیے راہ ہموار کرتا ہے۔

(زبیدہ مصطفیٰ، ڈان، 13 نومبر، 2015، صفحہ 9)

چین پاکستان اقتصادی راہداری کی حفاظتی لاگت میں 20 سے 30 فیصد اضافہ

چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبوں میں کام کرنے والے چینی باشندوں کی حفاظت یقینی بنانے کے لیے خصوصی حفاظتی دستوں کی تیاری پر آنے والی لاگت میں 20 سے 30 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔ اضافے کی وجہ بیرکوں اور دیگر بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے درکار زمین کی قیمت کا منصوبے کی لاگت میں شامل ہونا ہے۔ حکومت کی طرف سے عوامی شعبہ پر مبنی ترقیاتی پروگرام (Public Sector Development Program/PSDP) 2015-16 میں 22 اضافی دستوں کی تیاری کے لیے 7.5 بلین روپے اور ایک اور منصوبے کے تحت چھ اضافی دستوں کی تیاری کے لیے 2.35 بلین روپے کی لاگت شامل کی گئی تھی۔ اس طرح ان دونوں منصوبے کی کل لاگت تقریباً 10 بلین روپے بنتی ہے۔ پہلے پنجاب حکومت نے بیرکوں کی تعمیر کے لیے زمین فراہم کرنے کا عندیہ دیا تھا لیکن اب پنجاب حکومت نے آگاہ کیا ہے کہ وفاقی حکومت کو زمین خریدنی ہوگی جس کی وجہ سے منصوبے کی لاگت 10 بلین سے 13 بلین روپے

تک بڑھ گئی ہے۔

(مہتاب حیدر، دی نیوز، 10 نومبر، 2015، صفحہ 12)

ڈبلیو ٹی او اجلاس میں زرعی زرتلافی پر پاکستانی اعتراض

پاکستان نے ڈبلیو ٹی او کے وزارتی اجلاس میں عالمی زرعی معاہدے (Agreement on Agriculture/AoA) میں ترمیم کی کوششوں کو ناکام کردیا اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک میں زرعی مصنوعات کی برآمد اور پیداوار پر دی جانے والی زرتلافی کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ AoA (اے او اے) ڈبلیو ٹی او کا بین الاقوامی سطح پر تسلیم شدہ معاہدہ ہے جس پر بڑے پیمانے پر تنقید کی گئی ہے کیونکہ اس معاہدہ نے ان محصولات کا خاتمہ کیا ہے جن کے ذریعہ غیر ملکی زرعی اجناس اور اشیاء کی درآمد مشکل ہوتے ہوئے چھوٹے کسانوں کی پیداوار کو تحفظ فراہم کرتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ محصولات قومی آمدنی کو بڑھانے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ معاہدہ امیر ممالک کو اپنے زرعی شعبے کو زرتلافی دینے کی چھوٹ دیتا ہے۔ پاکستان نے تمام اشیاء خصوصاً کپاس، گندم اور چینی پر ترقی یافتہ اور بڑے ترقی پزیر ممالک کی جانب سے دی جانے والی زرتلافی کے خاتمے کا مطالبہ کیا ہے۔ وزیر تجارت نے اپنے بیان میں کہا کہ ''کپاس پاکستان کی معاشی شہ رگ ہے۔ ایک بار زرتلافی کا خاتمہ ہو جائے تو کپاس کی قدر میں ہونے والا تمام اضافہ ٹیکسٹائل اور کپڑے کی صنعت میں بھی نظر آئے گا۔ پبلک اسٹاک ہولڈنگ (public stock holding) کا مطلب ہے کہ حکومت کسانوں کی معاشی مدد کے لیے ان سے ایک مقررا قیمت پر فصل خریدتی ہے جو کہ اکثر امدادی قیمت یا ''سپورٹ پرائس'' کہلاتی ہے۔ (یہ فصل حکومت اپنے پاس ذخیرہ کرتی ہے۔ اس طرح کی حکومتی ذخیرہ اندوزی کو ڈبلیو ٹی او کے تحت ناگوار سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ یہ تجارت میں بے ترتیبی اور قیمتوں میں بگاڑ پیدا کرے گی)۔ اس حوالے سے ڈبلیو ٹی او میں پبلک اسٹاک ہولڈنگ پروپوزل یا مسودہ زیر بحث ہے۔ جس کے بارے میں پاکستان کا کہنا ہے کہ ڈبلیو ٹی او میں منظور شدہ عوامی ذخیرہ اندوزی اپنی موجودہ حالت میں پہلے ہی اس کی معیشت کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔ اس موضوع پر مزید مزاکرات، مصدقہ معلومات اور شواہد کی بنیاد پر ہونے چاہیے اور یہ یقینی بنایا جائے کہ ذخائر حد سے تجاوز نہ کریں اور برآمدی زرتلافی کی شکل نا اختیار کرلیں جو دوسرے ممالک کے کسانوں کے لیے نقصان دہ ہو۔

(دی ایکسپریس ٹریبیون، 19 دسمبر، 2015، صفحہ 10)

امریکی ریاست کیلی فورنیا نے گلائفوسیٹ کو امکانی طور پر کینسر کی وجہ قرار دے دیا

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے محکمہ تحفظ ماحولیات کے ادارے آفس آف انوائرمنٹل ہیلتھ ہیزرڈ اسسمنٹ (Office of Environmental Health Hazard Assessment\OEHHA) کی ویب سائٹ پر جاری کردہ معلومات کے مطابق ادارے نے کینسر پر تحقیق کرنے والی عالمی تنظیم (International Agency for Research on Cancer\IARC) کی سفارشات کی روشنی میں گلائفوسیٹ (glyphosate)، پیراتھیون (parathion)، ٹیٹرا کلورونفوس (tetrachlorvinphos)، میلاتھیون (malathion) کو ان کیمیائی اشیاء کی فہرست میں شامل کرلیا ہے جن سے کینسر ہوسکتا ہے۔

ایجنسی نے میلاتھیون اور گلائفوسیٹ کو ان اشیاء کے گروپ 2A (2 اے) میں رکھا ہے جس سے کینسر ہونے کے زیادہ امکانات ہیں جبکہ ٹیٹرا کلورونفوس اور پیراتھیون کو گروپ 2B (2 بی) میں رکھا ہے جس سے امکان ہے کہ کینسر ہوسکتا ہے۔ ایجنسی کا کہنا ہے کہ جانوروں پر تجربات کے بعد ایسے خاطر خواہ شواہد پائے گئے ہیں کہ ان چاروں کیمیائی اشیاء سے کینسر ہوسکتا ہے۔ یہ بات قابل زکر ہے کہ انسانی صحت کے لیے خطرناک قرار دی گئی کیمیائی شئے گلائفوسیٹ مونسانٹو کی زرعی دوا راؤنڈ اپ میں استعمال کی جاتی ہے جو فصلوں پر جڑی بوٹیوں کے خاتمے کے لیے دنیا کے تقریباً 160 ممالک میں بڑے پیمانے پر استعمال کی جارہی ہے۔

(http://oehha.ca.gov/prop65/CRNR_notices/admin_listing/intent_to_list/090415LCset27.html)

(بقیہ حوالہ جات: پاکستان آبپاشی نظام: اصلاحات یا نجکاری)

14. Indus River System Authority. "IRSA Act No. XXII of 1992". IRSA, 2011. Accessed from http://pakirsa.gov.pk/irsapublic/LegalProceedings.aspx#CHAPTER II
15. Punjab Irrigation and Drainage Authority. "Overview". Government of Punjab, 2014. Accessed from http://pida.punjab.gov.pk/overview
16. Sindh Irrigation and Drainage Authority. "Introduction." SIDA, 2012. Accessed from http://sida.org.pk/
17. Punjab Irrigation and Drainage Authority. "Area water boards." Government of Punjab, 2014. Accessed fromhttp://pida.punjab.gov.pk/area_water_boards
18. Punjab Irrigation and Drainage Authority. "Farmer Organizations." Government of Punjab, 2014. Accessed from http://pida.punjab.gov.pk/farmer_organizations
19. World Bank. "Pakistan irrigation and drainage: Issues and options."World Bank, 1994. Accessed fromhttp://www.wsip.com.pk/documents/paki_irri_drai_rpt.pdf
20. World Bank."Pakistan country water resources assistance strategy water economy: Running dry." p. xxii.
21. International Monetary Fund. "Issues in managing water challenges and policy instruments: Regional perspectives and case studies." International Monetary Fund, 2015, p. 12. Accessed from https://www.imf.org/external/pubs/ft/sdn/2015/sdn1511tn.pdf
22. The World Bank. "projects (Portfolio)." The World Bank Group, 2015. Accessed from http://search.worldbank.org/projects?qterm=pakistan&os=10